Regd. L. No.7243
Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1979

اس پرچہ میں :

بتقریب یوم پیدائش قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ

خطاب :

" مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی "

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون	بدلِ اشتراک
۳	۸۸۰۸۰۰	سالانہ
تین روپے	خط و کتابت	پاکستان ... -/۳۶ روپے
	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	غیر ممالک ... ۳ پونڈ
شمارہ ۱	جنوری ۱۹۷۹ء	جلد ۳۲

فہرست

۱- قائدِ اعظمؒ کے تصوّر کی اسلامی مملکت ۲
۲- قرآنِ کریم کی جامعیّت ۳
۳- تصفیہ کرسی نہیں ہوگی! ۴
۴- لمعات ۵
۵- مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"... (محترم پرویز صاحب کا خطاب) ۹
۶- حقائق و عبر و مراسلات .... (۱) بینکاری کا مسئلہ حل ہوگیا ۳۷
.... (۲) ایک اہم سوال - (۳) اقامتِ صلوٰۃ کا مقصد ....
.... (۴) ایتاءِ زکوٰۃ .... (۵) عائلی قوانین
۷- اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے .... (سلیم کے نام خط) ۴۲
محترم پرویز صاحب ....
۸- نظامِ ربوبیت ۵۵
۹- احتساب (قسط ۳) ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق بمقامِ اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ اہسپتال روڈ لاہور

قائدِ اعظمؒ کے تصوّر کی اِسلامی مملکت

اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اِسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد، دکن۔ کے طلباء کو انٹرویو)

قرآنِ کریم کی جامعیّت

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے، کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور یہ قوانین غیر متبدّل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں :-

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرّہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا ـــــ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (تقاریر - جلد دوم - صفحہ ۳۰)

تھیاکریسی نہیں ہوگی!

پاکستان، کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتّب کرنا ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اُصول آج بھی اُسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اِسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتّب کرنے کے سلسلے میں جو ذمّہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، اُن کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی، جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(اہلِ امریکہ کے نام براڈکاسٹ، فروری ۱۹۴۸ء۔ بہ حیثیتِ گورنر جنرل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہمارے نزدیک پچھلے ماہ (دسمبر) ہی کا نہیں بلکہ پچھلے سال (۱۹۷۸ء) کا سب سے اہم واقعہ شریعت بینچوں کی تشکیل کے متعلق صدر مملکت کا اعلان ہے۔ ہم اسے سب سے اہم واقعہ کیوں قرار دیتے ہیں؟ اس کی وجہ ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ مختصر الفاظ میں اس اعلان سے مقصود یہ ہے کہ:-

۱- پاکستان کے ہر ہائی کورٹ میں ججوں پر مشتمل شریعت بینچ قائم کیا جائے گا اور عدالتِ عالیہ (سپریم کورٹ) کے زیر اہتمام ایک بینچ جو ہائی کورٹ کے بینچوں کے فیصلہ کے خلاف اپیل سننے کا مجاز ہوگا۔

۲- مملکت کے ہر شہری کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ جس قانون کو اسلام کے خلاف سمجھے اسے صوبائی بینچ میں چیلنج کر دے۔ اسی قسم کا حق صوبائی حکومتوں اور وفاقی حکومت کو بھی حاصل ہوگا۔ نیز ہر بینچ کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ کسی کی طرف سے اس قسم کی درخواست موصول ہوئے بغیر از خود جس قانون کا چاہے جائزہ لے۔

۳- شریعت بینچ اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ جس قانون کا وہ جائزہ لے رہا ہے وہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا ان کے خلاف ہے۔ جس فیصلے کو وہ کتاب و سنت کے خلاف قرار دے اور اپیل سننے کے بعد عدالتِ عالیہ اس کی تصویب کر دے تو حکومت اس قانون میں اس فیصلہ کے مطابق ترمیم کر دے گی۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہر قابلِ اعتراض قانون، کتاب و سنت کے مطابق بنتا جائے گا۔

۴- شریعت بینچوں کو علماء اور وکلاء پر مشتمل پینل کی خدمات حاصل ہوں گی۔ لیکن ان کی حیثیت صرف مشیروں کی ہوگی۔ فیصلہ کا مجاز شریعت بینچ ہی ہوگا۔

۵- جن قوانین کو شریعت بینچ کے سامنے چیلنج کیا جا سکے گا ان میں ایسے رسوم و رواج بھی شامل ہوں گے جنہیں قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن حسبِ ذیل امور ان احکام سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(ا) آئینِ مملکت۔

(ب) مالی معاملات سے متعلق قوانین۔

(ج) مسلم پرسنل لاز (یعنی شخصی قوانین)۔

(د) کسی عدالت یا ٹریبونل کے طریق کار سے متعلق قانون۔

(س) بینک، انشورنس یا ٹیکسوں کے متعلق قوانین۔

۶- ان احکام پر بارہ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ سے عمل درآمد ہوگا۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۳ر دسمبر ۷۸ء)

شریعت بینچوں کی تشکیل کے فیصلے کو ملک میں عام طور پر سراہا گیا ہے۔ ان کے خلاف بنیادی طور پر جو اعتراض کیا گیا

ہے وہ یہ ہے کہ اتنے قوانین کو ان کے دائرۂ کار سے خارج قرار دیدیا گیا ہے کہ باقی قوانین بہت کم رہ جاتے ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں کہا یہ جاتا ہے کہ یہ استثنا عارضی اور وقتی ہے۔ رفتہ رفتہ باقی قوانین کو بھی ان کے دائرۂ اختیار میں لایا جائے گا۔ اس سلسلے میں وفاقی وزیر چودھری رحمت الٰہی صاحب نے اپنے ایک خطاب میں کہا ہے کہ:۔

> شریعت بینچوں کے صدارتی حکم میں ایک ترمیم کرنے کی تیاری کی جارہی ہے تاکہ ان امور کو جو سردست ان شریعت بینچوں کے دائرۂ اختیار سے باہر رکھے گئے ہیں انہیں ان کے دائرۂ اختیار میں لانے کیلئے ایک خاص مدّت کا تعین کیا جاسکے۔ پرسنل لاز، ٹیکسیشن، مالیاتی امور اور عدالتی طریق کار جیسے موضوعات کو صرف عارضی طور پر شریعت بینچوں کے دائرۂ اختیار سے باہر رکھا گیا ہے۔ مجوزہ ترمیم کے تحت ایک خاص مدت کے بعد ان امور کو بھی شریعت بینچوں کے دائرۂ اختیار میں لایا جائے گا۔ یہ استثنا اس لئے رکھی گئی تھی تاکہ ابہام اور انتشار سے بچا جاسکے۔ کیونکہ متبادل اداروں اور انتظامات کی عدم موجودگی میں اس کا امکان تھا۔
>
> (نوائے وقت لاہور۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء)

ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے سردست اسے کچھ اہمیت نہیں کہ کتنے قوانین شریعت بینچوں کے دائرۂ اختیار کے تابع رکھے گئے ہیں اور کتنے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی ایک قانون بھی ان بینچوں میں چیلنج کیا جاسکتا ہے تو ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے کافی ہے۔ ہماری بحث اصول سے ہے۔ قوانین کی تعداد سے نہیں اور یہی وہ اصولی نکتہ ہے جس کی بناء پر ہم نے اس اعلان کو سال گذشتہ کا اہم ترین فیصلہ قرار دیا ہے۔

دین (الاسلام) کا منتہیٰ تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کی شکل میں متشکل کر دینا تھا۔ اس جامعیت کی بنیاد ضابطہ حیات و قوانین کی وحدت تھی جو خدا کی کتاب کے اندر محفوظ ہے۔ اس عالمگیر برادری کی تشکیل کے پروگرام کی ابتداً ایک اُمت کی تشکیل سے کی گئی جسے اُمتِ مسلمہ، امتِ محمدیہ یا جماعتِ مؤمنین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ الدّین (الاسلام) اور وحدتِ اُمت لازم و ملزوم ہیں۔

صدرِ اوّل کے بعد یہ اُمت مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور اس طرح الدّین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ آزاد خطۂ زمین کا مطالبہ اس لئے کیا گیا تھا کہ اس میں پھر سے اُمت میں وحدت پیدا کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ وحدت قانون کی وحدت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اور قانون کی وحدت کتاب اللہ کی بنیادوں پر قائم کی جاسکتی تھی جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اپنے ایمان کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے مذہبی فرقے اس کے لئے تیار نہ ہوئے کیونکہ اُمت کی وحدت سے فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے مطالبہ یہ پیش کیا کہ قانون کی بنیاد کتاب و سنت پر رکھی جائے۔ بظاہر یہ مطالبہ بڑا معصوم اور مقدس تھا لیکن اس سے مقصد فرقوں کے وجود کو باقی رکھنا اور اُمت میں وحدت پیدا نہ ہونے دینا تھا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ (ضابطہ قانون) ہے اور یہ فقہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان فقہوں میں یک اختلاف شیعہ اور سُنّی کا ہے۔ پھر سنیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ (حنفی حضرات) کا، اگرچہ حنفیوں میں بھی دیوبندی اور بریلوی حضرات میں عقائد کے اعتبار سے سخت اختلاف ہے۔ بہرحال یہاں کم از کم تین فقہیں تو مسلّم ہیں ــــ شیعہ حضرات کی فقہ ــــ اہلِ حدیث کی فقہ اور حنفیوں کی فقہ ــــ ان میں سے ہر فرقہ اپنی فقہ

اور اس فقہ کے ہر حکم کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سنتِ رسول اللہؐ کے مطابق ہے۔ ان میں باہمی اختلافات کے سلسلہ میں جو مباحثے یا مناظرے ہوتے ہیں ان میں ہر فرقہ اپنے ہاں کی سنّت کو صحیح قرار دیتا ہے اور دوسروں کے ہاں کی سنّت کو ناقابلِ اعتماد۔ ان فقہوں کا تعلق بیشتر پرسنل لا (یعنی شخصی قوانین) سے ہے۔ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں روش یہ اختیار کی کہ پرسنل لا کی حد تک مسلمانوں کے ہر فرقے کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی اپنی فقہ پر عمل کرتے رہیں۔ پبلک لا، حکومت نے اپنے احاطۂ اختیار میں رکھ لئے۔ ان قوانین کا اطلاق تمام لوگوں پر یکساں ہوتا تھا۔ یہی صورت حال تشکیلِ پاکستان کے بعد یہاں بھی تھی۔ لیکن اگر اس مملکت کو اسلامی بنانا تھا تو پھر یہ صورتِ حالات باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسلامی مملکت میں پرسنل لا اور پبلک لا الگ نہیں ہوتے۔ ایک ہی قانون ہوتا ہے جو ساری اُمت پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے۔ اس سے فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ لیکن یہ حضرات فرقوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ دعویٰ اور مطالبہ کیا کہ پرسنل لا ہر فرقے کے اپنے اپنے ہونگے اور پبلک لا کتاب و سنت کی بنیادوں پر سب کیلئے مشترک بنایا جائے گا۔

طلوعِ اسلام کی جو شامت آئی تو اس نے یہ کہہ دیا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی پبلک لا بھی ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے مشترک اسلامی تسلیم کر لیں۔ اور اس کی وجہ ظاہر تھی کہ سنت کے جس اختلاف کی بنیاد پر پرسنل لا مشترک نہیں بن سکتا تھا، سنت کے اسی اختلاف کی بنا پر ایک مشترک پبلک لا کیسے وجود میں آسکتا تھا؟ چونکہ یہ حضرات نہیں چاہتے تھے کہ سنت کا یہ اختلاف ایک حقیقت بن کر قوم کے سامنے آجائے اس لئے انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ مشہور کر دیا جائے کہ طلوعِ اسلام منکرِ سنّت ہے، منکرِ شانِ رسالتؐ ہے، منکرِ حدیث ہے، دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اور نہ معلوم کیا کیا ہے۔ مودودی صاحب نے بیس برس کے بعد اس کا اعتراف تو کر لیا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر فی الواقعہ پبلک لا کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں لیکن مطالبہ ان کا بھی یہی رہا کہ پبلک لا کا ضابطہ کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ ان حضرات نے مطالبہ تو یہ جاری رکھا لیکن ایسا کوئی موقع پیدا نہ ہونے دیا جس سے یہ حقیقت قوم کے سامنے اُبھر کر آجائے کہ سنت کے متعلق ان حضرات کے باہمی اختلافات اس قدر گہرے اور شدید ہیں کہ اس کی رو سے کوئی ایسا ضابطہ، قانون مرتب نہیں ہو سکتا جسے یہ حضرات متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ شریعت بینچوں کی تشکیل سے متعلق مذکورہ بالا جیسے احکام اس قسم کا موقع بہم پہنچا دیں گے۔ یہ ہے وہ وجہ جس کی بنا پر ہم نے اس فیصلے کو اہم ترین قرار دیا ہے۔ یہ نکتہ ذیل کی مختصر مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔

۱۔ (پرسنل لا کے شریعت بینچوں کے حیطۂ اختیار میں آنے کے بعد) ایک اہلِ حدیث حنفیوں کے قانونِ طلاق کو چیلنج کر سکے گا کہ وہ سنت کے مطابق نہیں۔ یہ چیلنج مناظرہ نہیں بلکہ ایک مقدمہ ہوگا جو عدالت میں زیرِ بحث آئے گا۔ شریعت بینچ اس کے متعلق فیصلہ دے گا اور وہ فیصلہ، ضروری مراحل طے کرنے کے بعد ملک کا قانون بن جائے گا جس کا اطلاق اہلِ حدیث اور حنفی حضرات دونوں پر یکساں ہوگا۔ یہ قانون جس فرقہ کے خلاف جائے گا اس کا اس باب میں ردِّ عمل کیا ہوگا اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ یہ معاملہ حکومت اور اس فرقہ کے مابین ہوگا۔ اسی قسم کی صورت ہر قانون کے بارے میں ہوگی اور شیعہ سُنّی حنفی۔ اہلِ حدیث۔ سب فرقوں کو متاثر کرے گی۔ اگر شریعت بینچوں کے اس قسم کے فیصلے برقرار رہے تو رفتہ رفتہ قانون کی وحدت پیدا ہو جائے گی اور فرقے باقی نہیں رہیں گے ـــــ یہ خواب تو بڑا حسین ہے۔ دیکھیں اس کی تعبیر کیا نکلتی ہے!

۲۔ جہاں تک پبلک لاز کا تعلق ہے، مروّجہ قوانین میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے شریعت بینچوں میں چیلنج نہ کیا جا سکے۔ ان میں سے ہر قانون کے متعلق ہر فرقہ چاہے گا کہ قانون اس کی تسلیم کردہ سنت کے مطابق مرتب ہو۔ شریعت بینچ بہرحال کسی ایک فرقہ کی سنت کے مطابق ہی فیصلہ دے گا۔ اس قسم کے قانون کے خلاف باقی فرقوں کا ردّ عمل کیا ہوگا، اس کے متعلق کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے، اگرچہ جو صورتِ حال پیدا ہوگی اس کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ شریعت بینچوں کے لئے فیصلے کا مدار قرآن و سنت سے مطابقت ہوگا۔ ابھی تک ہم نے سنت کے بارے میں اختلافات کا ذکر کیا ہے لیکن ایسے قوانین بھی تو ہوں گے جو سنت کے مطابق لیکن قرآن کے خلاف ہوں گے (جیسے قانونِ وصیّت یا سنگسار کرنے کا قانون) ایسے قوانین کی صورت میں معلوم نہیں شریعت بینچ کیا فیصلہ دیں گے اور کس طرح فیصلہ کریں گے۔ اگر وہ سنّت کے مطابق قانون مرتب کریں گے تو وہ قرآن کے خلاف جائے گا اور اگر قرآن کے مطابق فیصلہ دیں گے تو وہ سنّت کے خلاف ہوگا۔ اور شرط ان پر یہ عائد کی گئی ہے کہ ان کا فیصلہ کتاب اور سنّت دونوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر شریعت بینچوں سے متعلق احکام پر حکمیت سے عمل درآمد کیا گیا اور شریعت بینچوں نے عادلانہ دیانتداری کو ملحوظ رکھا (جس کی ہمیں پوری پوری توقع ہے) تو رفتہ رفتہ تمام قوانین کتاب اللہ کے مطابق مرتب ہوتے جائیں گے اور سنّت کے صحیح اور غلط ہونے کے متعلق یہ معیار تسلیم کیا جائے گا کہ وہی سنّت، رسول اللہؐ کی ہو سکتی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ اس اعتبار سے دیکھیئے تو یہ فیصلہ ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ قرار پا سکتا ہے۔ لیکن اس پر عملدرآمد کے لئے بڑی مومنانہ فراست اور قلندرانہ جرأت کی ضرورت ہوگی۔ بینچوں کی تشکیل کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ مشیروں کے پینل کے سوا کوئی شخص مشیر یا وکیل کی حیثیت سے بینچ کے سامنے پیش نہیں ہو سکے گا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ دوسرے لوگوں کو اس کی اجازت ہوگی کہ زیرِ بحث قانون کے متعلق اپنا اپنا نقطۂ نگاہ اور اس کی تائید میں شہادات و اسناد قوم کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس سے انہیں یہ کہہ کر نہیں روک دیا جائے گا کہ معاملہ عدالت میں زیرِ بحث ہے اس لئے اس کے متعلق عدالت کے باہر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی حکومت سے ہماری گذارش ہے کہ جن قوانین کو سرِدست ان بینچوں کے حیطۂ اختیار سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے انہیں بھی ان کے دائرۂ اختیار میں لایا جائے اور اس میں بلا وجہ تاخیر نہ کی جائے۔ کم از کم پرسنل لاز کو سب سے پہلے ان کے زیرِ اختیار لایا جائے۔

یاد رکھئے۔ وحدتِ اُمت اور اس کے بعد وحدتِ انسانیت کا مدار وحدتِ قانون پر ہے۔ اور قانونی وحدت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہو جو تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ (تحریر محمود۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۸ء)

(٠)

باسمہٖ تعالیٰ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یومِ آزادی ۔ اگست ۱۹۷۸ء پر،
پرویز صاحب کا خصوصی درس

جسے بتقریب یومِ پیدائش قائدِ اعظمؒ (دسمبر ۱۹۷۸ء) طلوعِ اسلام میں شائع کیا جا رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت!

عہدِ رسالتمآبؐ میں جب مکی مہاجرینؓ کو مدنی زندگی میں پناہ، سکون، اطمینان، تمکن اور قوت و حشمت حاصل ہو گئی تو انہیں ان کی سابقہ زندگی اور بعد کے متغیر حالات کی یاد ان الفاظ میں دلائی گئی کہ:-

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۸/۲۶)

مکی زندگی میں تمہاری حالت یہ تھی کہ تم تعداد میں بھی قلیل تھے اور قوت کے اعتبار سے بھی بے حد کمزور تصور کیے جاتے تھے۔ تمہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ مخالفین تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ ان حالات میں اللہ تعالےٰ نے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانا دیا جہاں تم اکٹھے رہ سکتے ہو۔ اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت پہنچائی اور زندگی کی خوشگواریاں عطا کر کے سامانِ نشوونما بہم پہنچایا تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔

جو کچھ اس آیۂ جلیلہ میں کہا گیا ہے اس میں اور ملتِ پاکستانیہ کی تقسیمِ ہند سے پہلے اور بعد کی زندگی میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ میں نے یومِ آزادی کی تقریب پر اسی آیت کو اپنے خصوصی درس کا موضوع قرار دیا ہے۔ آخر میں میں اس آیت کے سیاق و سباق کی آیات کو پیش کر کے یہ بھی بیان کروں گا کہ ہماری موجودہ حالت کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ پہلے آپ تحریکِ پاکستان کے نمایاں خط و خال ملاحظہ فرمائیے جن میں یہ حقیقت سامنے آئیگی کہ اس تحریک کا مقصد کیا تھا، اس کی مخالفت کیوں ہوئی اور کن لوگوں کی طرف ہوئی، اور اس کی مدافعانہ جنگ کس نے لڑی اور کس انداز سے لڑی اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

اقبالؒ کا احسان

علامہ اقبالؒ کا ملّتِ اسلامیہ پر یہ عظیم احسان ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی اس فراموش کردہ حقیقت کی یاددہانی کرائی کہ مسلمان، رنگ، نسل، زبان، خون، وطن کی نسبتوں سے ماورا، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد قوم ہیں، اور یہ کہ اسلام ایک زندہ حقیقت اسی صورت میں بن سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قرآنی اصول و اقدار کے مطابق حکومت قائم کر سکیں۔ وہ ان حقائق کو جستہ جستہ تو یورپ سے اپنی واپسی کے بعد سے پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے منضبط شکل میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کیا۔ انہوں نے اس خطبے کی تمہید کے بعد اسلام کی اساس کو ان الفاظ میں نمایاں کیا:۔

> حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی نوعِ سو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اُس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعّال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:۔

> ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

> تنہا ایک ملک میں سات کروڑ[1] فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ مسلم ایشیا

---

[1] اس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

ان کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ:۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ:۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ:۔

پاکستان کا ہیولیٰ

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے......

مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؛ فرمایا کہ:۔

اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدیدہ (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آہستہ آہستہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

علامہ اقبالؒ نے اگرچہ اس حقیقت کو متعین طور پر واشگاف الفاظ میں بیان کیا لیکن اپنوں اور بیگانوں (بالخصوص اپنوں) نے..... ایک شاعر کا خواب سمجھ کر اسے کسی توجہ کا مستحق

نہ سمجھا۔ ہر چند وہ کہتے رہے کہ ؎

حقیقت ہے نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی

لیکن قوم نے اس کے باوجود اُسے شاعری ہی سمجھا تاآنکہ اس نظریئے کو عملی شکل دینے کے لئے وہ مردِ مجاہد سامنے آیا جسے خود اقبالؒ کی نگہ حقیقت بین و دُور رس نے اس مقصد کے لئے تلاش اور منتخب کیا تھا اور جسے بعد میں قوم نے قائدِ اعظمؒ کہہ کر پکارا۔ جب وہ اس تحریک کو لے کر میدان میں آئے تو

مخالفت

ہر ایک نے محسوس کیا کہ اب یہ نظریہ حقیقت بن کر رہے گا۔ اسے ناکام بنانے کے لئے ہر طرف سے مخالفت ہوئی۔ اصولی طور پر ان مخالفین کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ انگریز، ہندو اور خود مسلمان۔ مسلمانوں میں سیاسی لیڈر بھی شامل تھے، اور علماء کرام بھی۔ میں ان تینوں گروہوں کی مخالفت کو قدرے تفصیل سے بیان کروں گا۔ واضح رہے کہ یہ داستان میری شنید نہیں، دید ہے۔ میں دس سال تک فکری حیثیت سے اس جنگ میں خود شریک رہا۔ اور ہر محاذ کو گہری نظروں سے دیکھا اور ان کی طرف سے مخالفت کی مدافعت میں بھرپور کوشش کرتا رہا۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی اور انگریز اور ہندو کے سیاسی مصالح کا تقاضا تھا کہ ہندوستان غیر منقسم رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ان کی سیاسی مصلحتوں کا بھی تقاضا تھا لیکن ان کی بناءِ مخالفت محض سیاسی نہیں تھی۔ اقبالؒ کا پیش کردہ تصوّر اور قائدِ اعظمؒ کا دعویٰ یہ تھا کہ

بناءِ مخالفت

ہم ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں قرآنی اصولوں کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔ انگریز اور ہندو دونوں کو معلوم تھا کہ قرآنی حکومت سے مفہوم کیا ہے اور اس میں ان کے لئے کس قدر شدید خطرات مضمر ہیں۔ انگریز کی سیاست کا مدار استعمار اور نظامِ سرمایہ داری پر تھا اور یہی ہندو کے بھی عزائم تھے۔ قرآنی نظام ان دونوں لعنتوں کے لئے موت کا پیغام تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر یہ نظام کسی مختصر سے خطۂ زمین میں بھی نافذ ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز حیات پرور نتائج کو دیکھ کر دنیا لپک کر اس کی طرف آجائے گی اور وہ زندہ اقوام کی شکل میں باقی نہیں رہ سکیں گے۔ یہ بعینہٖ وہی خطرہ تھا جسے قریش کی نگاہوں نے بھانپا تھا اور جس سے محفوظ رہنے کے لئے ان کی انتہائی کوشش تھی کہ یہ نظام کسی دور دراز خطے میں بھی قائم نہ ہونے پائے۔ اسی لئے انہوں نے ہجرت کے بعد بھی اس قلیل سی جماعت کا پیچھا نہ چھوڑا اور سات آٹھ سال تک مسلسل مصروفِ پیکار رہے تاآنکہ انہیں آخری شکست میں ہمیشہ کے لئے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس حقیقت کی تائید کے لئے

انگریز کی نگاہ

کہ انگریز قرآنی تصوراتِ حیات کو خوب سمجھتا تھا ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ۱۹۳۵ء میں دِلّی میں پہلے پہل ریڈیو نصب ہوا تو انہیں عیدالاضحیٰ کی تقریب پر تقریر نشر کرنے کے لئے کسی موزوں مقرر کی تلاش

ہوئی۔ اسلامی حلقے میں میری کافی شہرت تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس مقصد کے لئے میرا نام تجویز کیا۔ لیکن میں سرکاری ملازمت سے منسلک تھا، اس لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا سرکاری ملازمین کو ریڈیائی تقریریں نشر کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہ سوال اصولی طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا گیا جس میں میں خود ملازم تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ تم جس موضوع پر تقریر کرنا چاہتے ہو، اس کا ملخص کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ قربانی کی عید کی تقریب ہے۔ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ انہوں نے شرک کی کس قدر مخالفت کی تھی۔ چونکہ یہ سوال اصولی تھا اور پہلے پہل زیرِ غور آیا تھا اس لئے بات بڑھتے بڑھتے سیکرٹری تک پہنچی۔ وہ (انگریز) سیکرٹری علومِ مشرقی میں بھی کافی درک رکھتا تھا۔ اس نے مجھے بلایا تو میں نے کہا کہ یہ ایک مذہبی تقریب ہے اور شرک جیسا مسئلہ میرا موضوع ہے اس لئے میری تقریر میں کونسی بات ... قابلِ اعتراض ہوسکتی ہے؟ یہ سُن کر وہ مسکرایا اور مجھ سے کہا کہ کیا قرآن مجید کی رُو سے شرک کا یہ مفہوم نہیں کہ حکومت صرف خدا کی ہوسکتی ہے اور اس کے حقِ حکومت میں کوئی انسان شریک نہیں ہوسکتا۔ اسی کو شرک کہا جاتا ہے۔ میں اس کی زبان سے یہ سُن کر ورطۂ حیرت میں گم ہوگیا۔ پھر سنبھل کر کہا کہ قرآن مجید کی رو سے حقیقت تو یہی ہے۔ جس پر اس نے کہا کہ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہاری تقریر کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سیاست تو ایک طرف، یہ نظریہ تو ہر حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ (ضمناً۔ اس کے باوجود اس نے مجھے یہ کہہ کر تقریر کرنے کی اجازت دے دی کہ ریڈیو والے تمہاری تقریر کا خود جائزہ لے لیں گے)۔

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہندوستان کے ایک مختصر سے گوشے ہی میں سہی، قرآنی اقدار کے مطابق کسی حکومت کا قیام انگریز کے نزدیک کس قدر خطرات کے امکانات اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی۔ چنانچہ لارڈ کرومر نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:-

> اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے۔
>
> (ہفت روزہ ایشیا مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۷۶ء)

واضح رہے کہ یہ شخص اس برطانوی قوم کا نمائندہ تھا جس کی حکومت نے، بغاوتِ ہند کے بعد یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں ہر قوم کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ یعنی مسلمانوں کی مذہبی آزادی کی تو وہ ضمانت دیتے تھے لیکن اسلامی حکومت کے قیام کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ لوگ مذہب اور دین کے فرق کو کتنی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ بنابریں انگریز کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت فطری تھی۔ انگریز نے اس باب میں کیا کچھ کیا اس کی خفیف سی جھلک قائدِ اعظمؒ کے ان بیانات سے لگ سکتی ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً تحریک کے دوران دیئے تھے۔ (مثلاً) انہوں نے سندھ مسلم لیگ

کی سالانہ کانفرنس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کہا تھا:۔

برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس میں قوت ہو۔ لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے۔

پھر انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء میں، لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا تھا:۔

برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگرس، مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ ہندو کو۔ ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہوا جس سے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہوتی تھی۔ اس بل پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا:۔

میں انگریز اور ہندو، دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے، زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو۔ ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو۔ ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔

انہوں نے ۱۹۴۲ء میں یوم پاکستان کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

اگر ہندو قیادت یا برطانوی قیادت، الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریوں اور سازشوں پر اتر آئیں تو ہم اس کی مدافعت کریں گے تاآنکہ ہم ایک ایک کر کے کٹ کر مر جائیں۔

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسہ عام میں فرمایا:۔

ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے۔ خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔

متحدہ سازش

اُس زمانے میں چین میں جنرل چیانگ کائی شک برسر اقتدار تھے، جن کے پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوامِ متحدہ میں لے جایا جائے۔ اس پر قائداعظمؒ نے نومبر ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھیں تو اسے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اپنی حفاظت کے لئے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگرس راج رچایا جا رہا ہوگا ہم ملک

کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔
پھر انہوں نے جولائی ۱۹۴۶ء میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ دنیا کی کوئی عدالت نہیں جس کے پاس ہم اس کے خلاف اپیل کر سکیں گے۔ دوسری پارٹی کانگریس ہے۔ وہ پوری طرح دوسری قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرے گی۔ اس لئے اب ہم اپنے حفظ بقا کے لئے آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہیں اور اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ براہ راست اقدام کی تیاریاں اور عمل ہماری پالیسی اور پروگرام کا جزو ہوگا۔

انگریز کی طرف سے مخالفت کا یہ محاذ قریب دس سال تک مسلسل جاری رہا۔ تاآنکہ انہوں نے اپنے آخری حربہ کے طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا۔ اس کی آمد کا مقصد کیا تھا اور اس سلسلے میں اسے قائداعظمؒ کے ہاتھوں کس قدر ذلت آمیز شکست کھانی پڑی، اس کی بابت خود اس کے اپنے الفاظ میں سنیئے۔ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں، بی بی سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈ کاسٹ ہوا تھا۔ اس میں اس سے یہ سوال پوچھا گیا کہ جب آپ ہندوستان گئے ہیں تو کیا اس وقت اس کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا:۔

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے، تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناحؒ صدر مسلم لیگ جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔

(طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۷۶ء)

اس محاذ آرائی میں قائداعظمؒ کس جرأت اور بیباکی کا ثبوت دیتے تھے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ لارڈ لن لتھگو (وائسرائے ہند) اپنے رعب داب، اور دبدبہ و طنطنہ کے لئے مشہور تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات کو بھی شامل کر لیا۔ قائداعظمؒ نے وار کونسل کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ اس کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائداعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا، لیکن قائداعظم ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود، سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسریگل لاج نہ پہنچے —

وہاں جاکر، بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں، کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب (INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM) میں لکھا ہے:-

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں، مسٹر جناحؒ کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے "جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جس میں کانگرس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔ (ص ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے، مشہور جریدہ اسٹیٹسمین نے، اپنی ۱۲ جولائی ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ:-

یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام - جنوری ۱۹۶۶ء)

ہندو کی طرف سے مخالفت

اب آیئے مخالفت کے اس محاذ کے دوسرے گوشے کی طرف یعنی یہ کہ ہندوؤں کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت کس شدت سے ہوئی۔ اس باب میں بھی میں صرف دو مثالیں پیش کروں گا جن میں ہندوؤں نے یہ کہا تھا کہ ہم مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کی جداگانہ آزاد حکومت کسی صورت میں قائم نہیں ہونے دیں گے۔ یعنی انہیں بھی، انگریز کی طرح، اس پر تو اعتراض نہیں تھا کہ مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو جائے۔ اعتراض اس پر تھا کہ وہ مملکت اسلامی ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگرسی لیڈروں میں، (مہاتما) گاندھی کے بعد، ممتاز ترین پوزیشن حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:-

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے اُسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ (میری کہانی۔ ص ۱۶۱)

ظاہر ہے کہ "منظم مذہب" سے پنڈت نہرو کا اشارہ اسلام ہی کی طرف تھا کیونکہ یہ انفرادی نجات نہیں بلکہ اجتماعی نظام کا داعی ہے۔ کانگریس کے ایک اور مشہور لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے.....

ایوانِ اسمبلی میں، جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، پکار کر کہا:-

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی، اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز - ۱۹۳۸ - ۹ - ۵)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ:-

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں، یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔ (ہندوستان ٹائمز - ۳۹ - ۱۱ - ۱۴)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا:-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے ..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن - ۱۹۴۶ - ۱۲ - ۹)

انہوں نے دوسرے مقام پر کہا:-

اگر مذہب کو علیحدہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک سچ کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں۔ اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز ۴۰ - ۶ - ۹)

یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:-

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے

کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت، قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے، مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطّہ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون - ۱۹۴۱-۱۱-۲)

لیکن جس طرح اس مخالفت میں انگریز کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی تھی اسی طرح ہندو کو بھی بُری طرح ناکامی ہوئی اور پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہوگیا۔ اس وقت ہندوؤں کی قلبی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس کہرام سے لگ سکتا ہے جو اس وقت انہوں نے مچایا تھا۔ اس زمانہ کے ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے جولائی ۱۹۴۷ء میں اعلان کیا۔

تقسیم ہند کے وقت

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنالیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع اختیار کرنا پڑیں۔

(آرگنائزر - ۴۷-۷-۳)

دیوان چمن لال کا شمار ہندوؤں کے اعتدال پسند طبقہ میں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھائی تھی کہ:-

میں نا امید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہم تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اپنی قوم کو لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔

(ایضاً)

پاکستان، انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۶ر جون کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے حسبِ ذیل ریزولیشن پاس کیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں، اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

اس مقام پر، میں پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کش مکش کیا تھی۔ کانگریس کا دعویٰ یہ تھا کہ اب سیکولر نظامِ حکومت کا دور آچکا ہے جس کی رُو سے ایک مملکت کے اندر بسنے والے تمام باشندے

ایک قوم شمار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا یہ دعویٰ تھا کہ اسلام کا اپنا نظام ہے جس کی رو سے ایک ہی ملک میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قومیں قرار دیئے جاتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ اسلام کے اس تقاضے کی بنیاد پر ہے۔ کانگریس کے مذکورہ بالا ریزولیشن میں آپ نے دیکھا کہ انہوں نے اسلام کے اس نظریہ کو باطل اور مردود قرار دیا تھا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اس ساری کشمکش کی بنیاد مذہب کے اختلاف پر تھی۔

بہرحال تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا۔ اس فیصلے پر کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو نے دستخط کئے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف قوم سے کہہ رہے تھے :۔

ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(PAKISTAN FACES INDIA , PAGE - 99)

یہ کچھ ہندوؤں نے تقسیم ہند کے وقت کہا۔ اس کے بعد بھی ان کے سینے میں یہ شعلہ مسلسل بھڑکتا رہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ :۔

پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے (اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ :۔

اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں محترم لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ :۔

پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۴۸-۱۰-۲۵)

اس پر اسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ :۔

تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگا..... چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔

راجہ مہندر پرتاپ نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا:۔

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہوگئی ہے۔ بنابریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت - ۵۰-۱۲-۲۱)

پاکستان کو ختم کر دینے کے مذموم مقصد کے حصول کے لئے ہندوستان نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا۔ لیکن اس میں اسے عبرت آموز شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد ہندوستان کے وزیرِ دفاع مسٹر چوّن نے اپنے بیان میں کہا تھا:۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔

ان مثالوں سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ ہندوؤں کی طرف سے پاکستان کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ یہاں نظریۂ پاکستان کے مطابق اسلامی حکومت قائم ہو۔ یہ چنگاری ان کے سینے میں ابھی تک سلگ رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کیا۔ وہاں کے موجودہ امورِ خارجہ کے وزیر، مسٹر باجپائی نے اُسے درگا دیوی قرار دیتے ہوئے اس کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول نچھاور کئے۔ ان تمام مبارک بادیوں کے جواب میں مسز گاندھی نے جو کچھ کہا وہ اس باب میں انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس نے کہا:۔

یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ اُن کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

اب مجھے مخالفت کے اس محاذ کے تیسرے گوشے کی طرف آجانا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ خود مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت کس طرح سے ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے میرے نزدیک ایک اور گوشے کی نقاب کشائی بھی ضروری ہے۔ اور وہ ہیں کمیونسٹ ——— قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے کراچی کے اجلاس منعقدہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اپنے خطاب کے

کمیونسٹ

دوران فرمایا:۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ (کانگریس کے علاوہ) ایک اور سب سے زیادہ چالاک، جماعت جو ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کر رہی ہے، کمیونسٹ ہیں۔ انہوں نے بہت سے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں ——— اور میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جھنڈوں کی تعداد کی کثرت میں عافیت ہے۔ (قہقہہ) ان کے ہاں سرخ جھنڈا ہے۔ روسی جھنڈا ہے۔ بالشویکی جھنڈا ہے ——— کانگریس کا جھنڈا ہے۔ اور اب وہ (خیر سے) ہمارا جھنڈا بھی ساتھ رکھ رہے ہیں (قہقہہ) جب کوئی شخص بہت سے جھنڈے اٹھائے ہو، تو میں اس کی طرف سے بدگمان ہو جاتا ہوں۔

(تقاریر جناحؒ - جلد دوم - صـ۴۲)

انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین سے ۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اب کچھ دنوں سے ایک پارٹی بہت متحرک ہو گئی ہے۔ وہ ہیں کمیونسٹ ——— ان کا پراپیگنڈہ بڑا پُرفریب ہے اور میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔ ان کا پراپیگنڈہ دامِ ہمرنگِ زمیں ہے۔ ایک خطرناک پھندا ہے۔ وہ سوشلزم، کمیونزم، نیشنل سوشلزم وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یاد رکھو! ہمارے ہاں ان "ازمز" یا اس قسم کی کسی اور ازم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ (تقاریر جناحؒ - جلد دوم صـ۴۳)

پھر انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس منعقدہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۴ء کے آخری اجلاس میں فرمایا:۔

یہ کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ ہم بے وقوف ہیں۔ ان کے اس قسم کے مغالطہ میں رہنے کے لئے کچھ وجہ جواز ضرور ہے لیکن (یہ قصہ، ماضی ہے) گذشتہ پانچ دس سال میں مسلمانوں میں ایسی تبدیلی آچکی ہے کہ کمیونسٹ انہیں بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے میں انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر انہوں نے پھر سے وہی کھیل کھیلنا چاہا تو انہیں ایسا منہ توڑ جواب دیا جائے گا (جسے وہ یاد رکھیں گے)۔ ہم مسلم لیگ کے ہلال اور ستارہ کے پرچم کے سوا کوئی پرچم نہیں چاہتے۔ اسلام ہمارا رہنما بھی ہے اور مکمل ضابطۂ حیات بھی۔ ہم کوئی زرد یا سرخ جھنڈا نہیں چاہتے۔ ہم کوئی ازم بھی نہیں چاہتے۔

(بحوالہ، نوائے وقت، مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۷۶ء)

قائدِاعظمؒ کو کمیونسٹ یا سوشلسٹ قرار دینے والے ان اقتباسات کو ذرا غور سے دیکھیں۔

مسلمانوں کی طرف سے مخالفت

اب آیئے اپنے گھر کی طرف یعنی اس طرف کہ خود مسلمانوں نے اسلامی مملکت کے قیام کے لئے خطۂ زمین کے مطالبہ کی کس طرح اور کس شدّت کے ساتھ مخالفت کی۔ اس سلسلہ میں پہلے دو ایک مثالیں ان مسلمان لیڈروں کی لیجئے جو کانگریسیوں کے سیاسی حلقے میں زیادہ مشہور تھے۔ جب مارچ ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا تھا:-

> مَیں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اِس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت چوٹیں لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں، ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۳۰-۴-۷)

اس کی ہمنوائی میں خان بہادر اللہ بخش (مرحوم) نے کہا کہ "یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے"۔ عبدالرحمٰن سرہندی (مرحوم) نے فرمایا۔ "یہ ہندوستان میں برطانوی تسلّط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے"۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (مرحوم) نے کہا۔ "یہ اسکیم برطانوی حکومت قائم رکھے گی"۔ مشہور احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (مرحوم) نے کہا۔ "یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے"۔

اور اس کے بعد آیئے اس لشکر کی طرف جو نیزوں پر قرآن لٹکائے اس مطالبہ کے خلاف میدانِ جنگ میں اترا تھا۔ قائدِاعظم نے جب مجھے تحریکِ پاکستان کی تائید میں ایک ذریعہ ابلاغ کی تجویز پر غور کرنے کے لئے بلایا تو مجھ سے فرمایا تھا کہ انگریز اور ہندو کی طرف سے اس تحریک کی جو مخالفت ہوگی اس سے بآسانی نپٹا جا سکے گا۔ لیکن وہ حضرات جو قال اللّٰہ و قال الرسول کے نعروں کے ساتھ اس کے خلاف نبرد آزما ہوں گے، ان کی مدافعت کے لئے خصوصی توجہ کی ضرورت ہوگی کیونکہ یہ حضرات عوام کو بآسانی ورغلا سکتے ہیں۔ (اسی مقصد کے لئے ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں آیا تھا)۔ اس گروہ میں اُس دَور کے بڑے بڑے جغادری علماء کرام شامل تھے — مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور ان کی معیت میں باستثناءِ چند۔۔۔ جملہ علماءِ دیوبند۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید و دیگر اربابِ جمیعتہ علماءِ ہند۔۔۔۔ اس زمانے میں مسلمانانِ ہند کے دلوں پر ان حضرات کے علم و فضیلت کی کس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی اس کے متعلق

کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا۔ مولانا آزاد کو

مولانا آزاد

ہندوؤں نے محض نمائش کی خاطر کانگریس کا صدر بنا رکھا تھا۔ جن دنوں لاہور میں مسلم لیگ کا سنہ ۱۹۴۰ء کا مشہور اجلاس ہوا تھا، انہی دنوں مولانا آزاد کی صدارت میں پرتاپ گڑھ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے فرمایا کہ:۔

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو جھکنے نہیں دیتا۔

یہ اس شخص (مسٹر گاندھی) کے متعلق کہا جا رہا تھا جو بڑے فخر سے اعلان کیا کرتا تھا کہ:۔

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں اور اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں ——— میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جز سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

(بحوالہ خطبۂ صدارت قائد اعظمؒ مسلم لیگ سیشن دلی۔ اپریل ۱۹۴۳ء)

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ اس کے خلاف مولانا آزاد نے اپنے مذکورہ صدر خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ:۔

یہ تخیل کہ مسلمان بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں ——— ایک ہندو اور دوسری مسلمان ---- انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔

جوں جوں تحریک پاکستان مقبول ہوتی گئی اور ہندوؤں نے محسوس کر لیا کہ اس طرح اس مطالبہ کو شکست نہیں دی جا سکتی تو رفتہ رفتہ ان کی مخالفت کی شدت میں کمی آتی گئی۔ لیکن مولانا آزاد آخری دم تک اس میں ویسے ہی متشدد رہے۔ انہوں نے اپنی کتاب (آزادیٔ ہند) میں خود کہا ہے کہ وہ تقسیم ہند کے اس وقت بھی مخالف تھے جب مہاتما گاندھی سمیت تمام ہندو لیڈر اس پر متفق ہو گئے۔ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کے مخالف رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ان کی کتاب (INDIA WINS FREEDOM) ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کتاب میں دو قومی نظریہ کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے ان الفاظ میں پھوڑتے ہیں کہ:۔

لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں، مذہبی یگانگت اور وحدت پیدا ہو سکتی ہے بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری متشکل کرنی چاہی تھی جو نسلی، لسانی،

معاشی اور سیاسی حدود سے بلند ہو کر وجود میں آئے لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر سے عرصے کے بعد جسے زیادہ سے زیادہ سو سال کا عرصہ کہئے، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ملکوں کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے۔ (P. 227)

استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ مولانا آزاد کا یہ کہنا ہے کہ اسلام نے دین کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کی کوشش کی، لیکن وہ تجربہ ناکام رہا۔ اور اب اسے دہرانا حماقت اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا بہت بڑا فریب ہے۔ یہ وہی آزاد ہیں جو مسلمانوں کو برسوں تک یہ دعوت دیتے رہے کہ:۔

یہ برادری (یعنی امت مسلمہ کی برادری) خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے ..... دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ (الہلال)

علماء دیوبند

ہندوستان میں علماء دیوبند کو خاص مقام حاصل تھا اور وہ اسلام کے صحیح ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ فقہی معاملات میں بے شک ان کا علم بڑا وسیع تھا لیکن جہاں تک اسلام کے سیاسی نظام کا تعلق ہے ان کا نظریہ اسلام کی اصل و اساس کے خلاف تھا۔ وہ مغرب کے جمہوری نظام اور سیکولر حکومت کو عین مطابق اسلام قرار دیتے۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار، مدینہ (بجنور) کی سترہ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں، مولانا اسرار احمد آزاد (دیوبندی) کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:۔

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں دار العلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

تحریک پاکستان کی بنیاد ہی اس اصل الاصول پر تھی کہ اس خطۂ زمین میں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ علماء دیوبند کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی۔ چنانچہ (بایں استثناء چند) ان علماء نے اس تحریک کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل تھے اور تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش۔ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے اور علامہ اقبالؒ کے مابین جو معرکہ برپا ہوا تھا اس کی شہرت عام ہے۔ لہٰذا اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ——— جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے ان کا ارشاد تھا کہ:۔

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔

(زمزم۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

مذہبی آزادی کے متعلق وہ فرماتے تھے کہ :-

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہبِ اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنیؒ کا پمفلٹ - متحدہ قومیت اور اسلام - صفحہ ۶۱)

ان کی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ حیدر آباد (دکن) کے اخبار "رہبرِ دکن" کی ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی تھی۔

مولانا حسین احمدؒ صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیتے اور قائدِ اعظمؒ کو "کافرِ اعظم" کا لقب دیتے ہوئے حال ہی میں جو فتویٰ دیا تھا اس کا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی نے اپنے ایک مکتوب میں جواب دیا ہے۔

(بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء - صفحہ ۱۰۱۲)

مفتی محمود

ضمناً مفتی محمود صاحب انہی مولانا مدنی (مرحوم) کے شاگرد ہیں۔ یہ اُس جمعیت العلماءِ ہند کے ایک اہم رکن تھے جس کے صدر مولانا مدنیؒ تھے۔ چنانچہ وہ اب تک اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی باک نہیں سمجھتے کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مثلاً نوائے وقت نے اپنی اشاعت بابت ۲۷ ستمبر سنہ ۱۹۷۷ء کے اداریہ میں لکھا تھا :-

قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود اس معاصر سے اپنے خصوصی انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خودمختاری میں مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر محفوظ سمجھتے تھے اس لئے تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔

اسی طرح انہوں نے، خان عبدالقیوم خان کے ایک الزام کے جواب میں کہا تھا کہ "میں نے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔" (نوائے وقت، ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۷ء) جمعیت علماء پاکستان کے سینئر نائب صدر سعید محمود شاہ گجراتی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ :-

مولانا مفتی محمود نے خود پی، این، اے کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ (روزنامہ مشرق مورخہ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء)

یعنی پاکستان قائم کرنے کے گناہ میں تو شامل نہیں تھے لیکن اس "گناہ کے حاصل" (مملکتِ پاکستان) کے مفادات کو زیادہ سے زیادہ بٹورنے کے لئے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں!

مولانا نورانی

علمائے دیوبند کے بعد ہمارے سامنے مولانا احمد رضا خان بریلوی (مرحوم) کے متبعین آتے ہیں۔ جمعیت العلمائے پاکستان کے صدر مولانا احمد شاہ نورانی اسی فرقہ کے نمائندے ہیں۔ اس فرقہ کی طرف سے صادر کردہ فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ :-

بحکمِ شریعت، مسٹر جناح اپنے ان عقائدِ کفریہ، قطعیہ، یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج

از اسلام ہے۔ اور جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا ان کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر مرتد اور مشرالانام ہے اور بے توبہ مرا تو مستحقِ لعنتِ عزیزِ علّام۔

(تجانب اہلسنۃ عن اہل الفتنۃ۔ ص ۱۲۲)

اسی فرقہ کے ایک ممتاز عالم؛ مولانا اولادِ رسول نے ایک رسالہ "الجوابات السنیہ" شائع کیا۔ اس میں حزب الاحناف (لاہور) کے مولانا ابرکات سید احمد (مرحوم) کا یہ فتویٰ درج تھا کہ:۔

لیگ کی حمایت کرنا۔ اس میں چندے دینا۔ اس کا ممبر بننا۔ اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔

ان علماء کے علاوہ مجلسِ احرار بھی تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں بڑی متشدد تھی۔ یہ رسوائے زمانہ شعر اسی مجلس کے ایک ممتاز لیڈر (مولانا) مظہر علی اظہر کا ہے؂

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا
یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم
(معاذ اللہ)

حالانکہ یہ الزام واقعہ کے بھی یکسر خلاف تھا ——— اسی مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۶ء میں ایک قرارداد پاس کی تھی جس میں کہا تھا کہ:۔

یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفتوں کا یہ ہجوم بھی کچھ کم صبر آزما اور ہمت شکن نہیں تھا لیکن اس کے بعد، میں جس مخالفت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس کی زہر فشانیوں کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ اگر اس کی مدافعت کے لئے قائدِ اعظمؒ جیسا روشنی کا مینارہ نہ ہوتا تو یہ سیلابِ بلا اس سفینۂ برگِ گل کو واقعی لے ڈوبتا۔ یہ مخالفت تھی سید ابو الاعلےٰ

مودودی صاحب

مودودی صاحب کی طرف سے۔ وہ بڑی گہری سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق مخالفت کے اس میدان میں نبرد آزما ہوئے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ایک نیشنلسٹ صحافی کی شکل میں ہوا۔ وہ قریب پانچ چھ سال تک جمعیتہ العلماء ہند کے اخبار "الجمعیتہ" سے وابستہ رہے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کی سوانح عمری بھی لکھی۔ جب اس اخبار کی مالی حالت خراب ہوگئی تو وہ اپنے برادر بزرگ مولانا ابوالخیر صاحب کے پاس حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ وہیں انہوں نے اپنی اسکیم کی بنیادی اینٹ رکھی۔ اس زمانے میں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ "دو قومی نظریہ" کا شہرہ عام ہو رہا تھا اور اس سے تحریکِ پاکستان کے لئے فضا ہموار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں اس نظریہ کی تائید میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ اس طرح انہوں نے شمالی ہندوستان کے اقبالی حلقہ میں مقبولیت حاصل کر لی اور یہی چیز ان کے حیدرآباد سے پٹھانکوٹ منتقل ہونے کا موجب بنی۔ (میں اس تفصیل کو اپنے ایک مبسوط خطاب میں بیان کر چکا ہوں جو طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں پیش کیا گیا تھا اور جسے بعد میں "گہری سازش"

کے عنوان سے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا تھا)۔ میں اس مقام پر اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس طرح مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کے متفقین کے ذہنوں میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ پراپیگنڈہ کے فن میں ماہر ہیں اور ان کی اسکیمیں بڑی لطیف اور دوررس ہوتی ہیں۔ یوں انہوں نے قوم کے ہاں وہ اعتماد حاصل کر لیا جو نیشنلسٹ علماء کھو چکے تھے۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہی کچھ کرنا شروع کر دیا جو کانگریسی علماء کرنا چاہتے تھے۔

تحریک پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اور یہ قوم ایک الگ مملکت قائم کرنے کا حق رکھتی ہے جس میں یہ اسلامی حکومت قائم کر سکے۔ مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہ نظریہ عین مطابق اسلام ہے کہ قومیت کا مدار ایمان کے اشتراک پر ہے اور اس بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایک جداگانہ قوم قرار پاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان ہیں کہاں جنہیں ایک قوم قرار دیا جاسکے۔ موجودہ مسلمانوں کو مسلمان فرض کر لینا بہت بڑی مغالطہ آفرینی ہے۔ ان کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" ان کے اسی قسم کے دعاوی سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً اس میں انہوں نے لکھا کہ :-

یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی غلط فہمی قابل داد ہے .... ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا، اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔

(جلد سوم - صفحہ ۱۳۰)

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔

(جلد سوم - صفحہ ۱۲۶)

اِن وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد، جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اِس تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

(جلد سوم - صفحہ ۵۶)

اگر آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۱۶۷)

اس کتاب میں انہوں نے مسلم لیگ کے قائدین کو مخاطب کر کے لکھا:۔

اگر یہ آپ کی قومیت ہے اور یہ آپ کی کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مفاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرما لیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے .... اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا پر رکھ رہے ہیں، اوّلاً اسلام کے خلاف ہیں بلکہ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لئے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۳۶) .... جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کریں، ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے۔ ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۷۰)

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ جو کچھ کانگرسی علماء کھلے بندوں کہتے تھے بعینہٖ وہی کچھ مودودی صاحب اپنی نقاب پوش اسکیم کے تابع کہتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق مودودی صاحب جو کچھ کہتے تھے آپ نے سُن لیا ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ اجلاس ۱۳۴۸ھ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں مولانا شاہ معین الدین اجمیریؒ (مرحوم) نے تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا:۔

اگر اس کا (اسلام یا مسلم کا) مفہوم صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک قوم یا مخصوص نسل کا نام یا عنوان ہے تو جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ہر ایک نا آشنائے مذہب کے ہاتھ میں اسلام' یا مسلم کی باگ دی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس قوم کا جو مسلمان کہلاتی ہے بحیثیت قوم ہونے کے خیر خواہ اور مخلص ہو۔ لیکن اگر اسلام کا تعلق عقائد و اعمال سے ہے اور ان کے فقدان سے اسلام پر اثر پڑ سکتا ہے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کا قائد وہی ہونا چاہیئے جس میں یہ مذہبی روح موجود ہو اور جو غیر ضروری وسیع الخیالیوں کی آمیزش و اختلاط سے کمزور اور فنا نہ ہو گئی ہو ورنہ اس کی قیادت میں جو ترقی ہوگی وہ درحقیقت اسلام یا مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ اس کا تعلق قوم یا ملک سے ہوگا جس کی پرستش اس عہد میں اعلیٰ درجہ کی روشن خیالی سمجھی جا رہی ہے۔ ایسی ترقی بعض اوقات اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سخت مضر بلکہ عذاب الٰہی کی صورت میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اسی ترقی کی فضا میں فروعی اعمال اور جزئی عقائد

بجائے خود رہے اسلام کے اصول اور ضروری شعائر تک کے متعلق غیر ضروری ہونے کا فتویٰ نا بو یافتہ جماعت کی جانب سے صادر ہونے میں تامل نہیں ہوتا اور اسی طرح تدریجاً تمام اسلامی بندشوں کو توڑ دینے کا سلسلہ قائم کر دیا جاتا ہے۔

(پمفلٹ "اشرف الافادات" شائع کردہ۔ مرکزیہ جمعیۃ العلماء ہند۔ مئی ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۱۴)

آپ دیکھئے کہ جو کچھ کانگرسی علماء کہتے تھے اسی کا چربہ مودودی صاحب پیش فرما رہے تھے۔ گویا مودودی صاحب اسی نغمہ کی صدائے بازگشت تھے۔

عام ہندوستانی مسلمانوں سے آگے بڑھ کر مودودی صاحب کے نشتر کا ہدف، خود قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کے دوسرے راہنما تھے۔ ان کے خلاف انہوں نے اس قدر زہر اگلا تھا کہ اس کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک ضخیم تالیف کی ضرورت ہوگی۔ وہ بار بار لکھتے تھے:۔

> افسوس کہ لیگ، کے قائد اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی ....
> نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۳۷) ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استاد فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ (جلد سوم صفحہ ۷۰) ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خورد بین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۷۲) ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمت کعبہ کدھر ہے۔ اور اسباب عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دو فیصدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۷۲)

وہ اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

> نہ ان کی جماعت، اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت، اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۸۲)

اب آپ دیکھئے کہ مسلم لیگ کی قیادت کے متعلق نیشنلسٹ علماء کیا کہتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا:۔

> پس جس جماعت میں زندیقوں اور دہریوں کی بھرمار ہو۔ اور جس کے ارباب بست و کشاد کی

سرشت میں مغربی تہذیب اور مغربی تمدن اور مغربی معاشرت طبیعت ثانیہ بن چکی ہو، وہ اسلامی جماعت اور سوادِ اعظم اور شرعی تنظیم کیسے قرار دی جا سکتی ہے اور اس جماعت سے اصلاح قوم اور ترقی اسلام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ ..... افسوس کہ مسلمانوں کی نکیل اور باگ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام کے دوست نما دشمن ہیں۔ وہ علم دین، دینی فہم عقل، سب سے معرّا ہیں۔ اور جب وہ خود گم کردہ راہ ہیں، دوسروں کو کیا راہ بتائیں گے ..... ان کی حالت یہ ہے کہ صورت سے بھی مسلمان کہلانے کے قابل نہیں۔

(پمفلٹ۔ اشرف الافادات۔ صـ ۱۱-۱۰)

سوچئے کہ قائدِ اعظمؒ بلکہ مسلم لیگ کی پوری کی پوری قیادت کے خلاف جو الزامات مودودی صاحب عائد کر کے قوم کو ان سے برگشتہ کرتے تھے ان میں اور ان الزامات میں جو کانگرسی علماء تراشتے تھے، ذرا سا بھی فرق ہے! ان حقائق سے واضح ہے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت درحقیقت کانگرسی علماء ہی کی ایک شاخ تھی جو ایک مقدس نقاب اوڑھ کر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے لئے نئے راستوں سے میدان میں آئی تھی۔ ان کی طرف سے یہ مخالفت تقسیم ہند کے زمانے تک مسلسل جاری رہی حتیٰ کہ جب اصولی طور پر تشکیلِ پاکستان کا فیصلہ ہو گیا تو انہوں نے اپنے تیروں کا رُخ ان صوبوں کی طرف موڑا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ وہاں جا کر جلسے منعقد کئے اور ان سے کہا کہ اگر پاکستان بن گیا تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے اس لئے اب بھی وقت ہے کہ تم اس مطالبے کی مخالفت کرو۔ میں یہ تفاصیل بھی گذشتہ "بیس برس سے پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لہٰذا، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے پمفلٹ "گہری سازش" شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام)۔

یہ تھا تحریکِ پاکستان کی مخالفتوں کا ہجوم جن کا مقابلہ قائدِ اعظمؒ تن تنہا کر رہے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحریک کے ہم نوا لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے لیکن ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ فوج کے سپاہیوں کی سی تھی۔ ان کے کماندار صرف ایک ہی تھے۔ انہوں نے یہ جنگ کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی اس کا اعلان انہوں نے ۱۹۴۲ء میں "عربک کالج دہلی" میں ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا تھا۔

اورنگ زیب روڈ نئی دہلی پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکریٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں۔ میرا اسلحہ خانہ اس قدر ہے ——— ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کر کے دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر اور پرسنل اسسٹنٹ ——— بس یہ ہے ہمارا ساز و سامان اور اسلحہ اور فوج۔

(پمفلٹ۔ عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار۔ صـ ۲۱)

حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف مطالبۂ پاکستان کی صداقت اور اس مردِ مجاہد کے کردار کی پاکیزگی اور بلندی تھی جس

سے انگریز، ہندو اور خود "اسلام" کے علمبردار مسلمان لیڈروں کی پیہم اور متحدہ مخالفتوں کے علی الرغم اس جنگ میں ایسی شاندار کامیابی نصیب ہوئی اور یہ جانباز، ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید کے بغیر، ایسی عظیم مملکت قوم کو دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا، اُس مہلک عارضہ کے ہاتھوں جسے انہوں نے برسوں تک اس لئے اپنے سینے میں چھپائے رکھا کہ اگر دشمنوں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ ان کی موت کے انتظار میں اس جنگ کو طول دیتے جائیں گے۔ یہ قربانی کی انتہا تھی؛

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تشکیلِ پاکستان کے بعد

یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ جن عناصر نے تحریکِ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ ہجوم کر کے پاکستان آ گئے۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ یہ قائدِ اعظمؒ کی کشادہ ظرفی تھی کہ انہوں نے انہیں پاکستان آنے سے روکا نہیں، یا جن گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں میں وہ اس وقت گھرے ہوئے تھے ان کی وجہ سے انہیں اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی۔ وجہ کچھ بھی ہو، یہ خطرہ بڑا مہیب تھا جس کے لئے یہاں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ پاکستان میں دیگر عناصر نے تو اس کا اعتراف بھی کیا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ تحیّر انگیز تماشہ کہیں اور نہیں دیکھا ہو گا کہ جس جماعت نے اس میں انتہا کر دی تھی وہ برابر کہے جا رہی ہے کہ ہم نے اس تحریک اور مطالبہ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ ایسا کہنے میں بھی انہوں نے اپنی مخصوص تکنیک سے کام لیا ہے۔ ستمبر ۱۹۷۷ء میں پاکستان ٹائمز کے نمائندہ نے مودودی صاحب کا ایک انٹرویو لیا جس میں ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی؛ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:-

> ہمارے لئے اصل بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک گز زمین ایسی مل جائے جہاں خدا کی مشیت کا غلبہ ہو تو وہ خطہ دوسروں سے زیادہ مقدس ہو گا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان سرزمینِ اسلام ہو، لہٰذا، ہم اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے؛ لیکن جو لوگ تحریکِ پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے وہ ہمیں سچے مسلمان نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دلوں میں اس تحریک (کے اسلامی ہونے) کے متعلق شکوک کی یہ وجہ تھی۔ ہم قائدِ اعظمؒ ہی کے خلاف نہیں تھے۔ ہم اس پوری کی پوری قیادت کے خلاف تھے جو تحریکِ پاکستان کو چلا رہی تھی۔ جب پاکستان قائم ہو گیا تو ہم نے اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد جاری رکھی۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۷۷-۹-۲۵)

اس منطق کی انبلہ فریبی غور طلب ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ ہم نے اس تحریک کے قائدین کے خلاف پروپیگنڈہ کیا تھا۔ اس مغالطہ آفرینی توجیہہ کا تجزیہ ایک مثال کی رو سے کیجئے۔

ایک شخص مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے دیگر مقتدر لیڈروں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ بدکردار ہیں، بداخلاق ہیں، بدنیت ہیں، فریب کار ہیں، منافق ہیں، اسلام کے دشمن ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب اس سے کہا جائے کہ تم جماعت اسلامی کی مخالفت کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہے کہ میں جماعتِ اسلامی کی مخالفت تھوڑا کرتا ہوں۔ میں تو صرف اس جماعت کی قیادت کو ہدفِ طعن و تشنیع قرار دیتا ہوں۔ کہیئے کہ ایسا جواب دینے والے کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ (بلا تشبیہ) ذرا آگے بڑھیئے۔ مغرب کے متعصب مستشرقین کی تکنیک یہ ہے کہ وہ براہِ راست اسلام پر حملہ نہیں کرتے بلکہ حضورؐ نبی اکرم کی سیرتِ طیبہ کو داغدار بنانے کی سعیٔ مذموم کرتے رہتے ہیں۔ آپ سوچیئے کہ ان کے اس پروپیگنڈہ سے متأثر ہو کر اگر کوئی شخص (معاذ اللہ ہزار بار معاذ اللہ) حضورؐ کو فریب کار سمجھ لے تو کیا وہ اسلام کو ایک سچا دین تصور کرلے گا؟ ——— ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی تحریک کی مخالفت کے لئے مؤثر ترین حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے قائدین کے کیریکٹر کو گھناؤنا کر دیا جائے۔ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے قائدین کے خلاف پروپیگنڈہ اس تحریک کے دوران ہی جاری نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے انہیں تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی نہیں بخشا۔ ان کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کا پہلا پرچہ جون ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے تقسیم ہند کی داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

> یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

اب آگے بڑھئے مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے باوجود اپنے آپ کو اسلامی نظام کی اقامت کا سب سے بڑا داعی قرار دیتے اور اس مملکت کو اسلامی بنانے کی جدوجہد کا سب سے بڑا مجاہد ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مملکت کے اسلامی بننے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی صاحب ہیں۔ سطحی نگاہوں کو (بالخصوص انہیں جو ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہیں) یہ بات اعجوبہ سی نظر آئے گی۔ لیکن جو حضرات ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیں گے انہیں اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوگی یہ نکتہ بھی تفصیل طلب ہے لیکن قلتِ وقت کی وجہ سے میں اس کے صرف ایک گوشے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران مودودی صاحب سے کہا جاتا تھا کہ اس وقت ساری جنگ ایک ایسے قطعۂ زمین حاصل کرنے کے لئے ہے جس میں اسلامی مملکت قائم کرنے کا امکان ہو۔ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اُس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (سیاسی کشمکش۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۶۸)

اسلامی مملکت

یعنی وہ بظاہر تو یہ کہتے تھے کہ ایسی مملکت اسلامی بن نہیں سکے گی، لیکن درحقیقت ان کا مطلب یہ تھا کہ تم ایسا خطۂ زمین حاصل کر لو۔ پھر میں دیکھوں گا کہ اس میں کس طرح اسلامی مملکت قائم ہو سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں وہ گذشتہ تیس سال سے کیا کرتے چلے آ رہے ہیں اسے گہری نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے پہلا دعویٰ یہ کیا کہ یہ مملکت اسلامی اسی صورت میں بن سکتی ہے جب یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اس کے بعد کہا کہ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ضابطۂ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح کوئی ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہر حکومت کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ یہ لوگ اسلامی قوانین نافذ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ زمانے کے تقاضے ملاحظہ ہوں کہ انہیں بیس سال کے مسلسل پروپیگنڈہ کے بعد اس کا اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ:-

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔
>
> (ایشیا - مورخہ ۲۳ راگست سنہ ۱۹۷۶ء)

اور یہ معلوم کر کے آپ حیران ہوں گے کہ یہ حضرات اس کے بعد بھی برابر یہ مطالبہ کئے جا رہے ہیں کہ پبلک لاز کا ضابطۂ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔

اس ایک نشانے سے دو شکار مارے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس معیار کے مطابق نہ اسلامی قوانین مرتب ہوں گے، نہ یہ مملکت اسلامی بن سکے گی۔ اور دوسرا یہ کہ اس سے، جس حکومت کے خلاف جی چاہے پروپیگنڈہ کیا جا سکے گا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے سنہ ۱۹۷۶ء میں منعقد کی جانے والی وکلاء کانفرنس میں کہا تھا۔

> یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی گئیں اور یہ حاصل اس لئے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی قوانین نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لاالٰہ الاّ اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں کی جائیدادیں تباہ کروا دیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہوا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا جس کے لئے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں، اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔
>
> (ایشیا - مورخہ ۹ رمئی سنہ ۱۹۷۶ء)

اس میں البتہ ایک گنجائش رکھ لی گئی۔ فرمایا:-

> میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قوانین کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف

اقتدار مجھے دو

اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ تحریکِ پاکستان کی دوسری مخالف جماعت، جمعیۃ العلماء ہند تھی جس کے نمائندہ مفتی محمود صاحب ہیں۔ یہ پاکستان میں آ تو گئے ہیں لیکن انہوں نے اسے ابھی تک دل سے قبول نہیں کیا۔ یہ محض ہمارا قیاس نہیں، حقیقت ہے جس کے ثبوت میں چند مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ ان میں ایک اور کا اضافہ کر لیجئے۔ حال ہی میں، مولانا نورانی صاحب نے ملتان میں کہا ہے کہ:-

> متحدہ محاذ کے سربراہ، مفتی محمود صاحب نے ابھی تک پاکستان کو قبول نہیں کیا اور وہ چاہتے ہی نہیں کہ یہ مستحکم ہو۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ ۲۱ جولائی ۱۹۷۸ء)

یہ ہیں وہ حضرات جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ناکام رہنے کے بعد یہاں آ گئے کہ جو کچھ وہاں نہیں کیا جا سکا تھا، یہاں آ کر کر لیا جائے۔

موجودہ حالت

عزیزانِ من! میں نے اس درس کا آغاز سورۃ انفال کی اس آیت سے کیا تھا جس میں جماعتِ مومنین کی مدنی زندگی میں ان سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی سابقہ حالت پر غور کرو۔ تم وہاں اقلیت میں تھے اور کمزور بھی تصور کئے جاتے تھے۔ خدا نے تمہیں اپنی عنایات سے نوازا۔ تمہیں رہنے کے لئے نہایت محکم ٹھکانا دیا۔ قوت و شوکت عطا کی۔ نشوونما کا نہایت خوشگوار سامان ارزانی فرمایا۔ یہ سب انعامات اس لئے عطا کئے کہ دینِ خداوندی کو متمکن کرنے کے لئے تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔ اس سلسلے میں انہیں کچھ مثبت ہدایات دی گئیں کچھ منفی۔ مثبت ہدایات کے سلسلے میں کہا کہ:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)

اے جماعتِ مومنین! جب اللہ اور اس کا رسول تمہیں اس بات کی طرف بلائے جس میں تمہاری حقیقی زندگی کا راز پوشیدہ ہے تو تم اس کی دعوت پر لبیک کہا کرو۔

یہ مثبت تاکید تھی۔ دوسری طرف یہ فرمایا کہ:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۸/۲۷)

اے جماعتِ مومنین! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم نہ تو اس نظامِ خداوندی سے خیانت کرو جس کے لئے تمہیں یہ نعمتیں دی گئی ہیں اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں خیانت کرو جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اور اس نتیجہ کی وضاحت بھی یہ کہہ کر خود ہی کر دی کہ:-

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)

یاد رکھو، اس قسم کی خیانتوں سے وہ تباہی آتی ہے جو مملکت کے ظالم طبقے تک ہی محدود نہیں رہا کرتی، سارے کے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات اپنی نتیجہ خیزیوں میں بڑا سخت واقع ہوا ہے۔ تم ایسا انتظام کرو کہ اس قسم کی تباہی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

تیس برس کی مسلسل اجتماعی اور انفرادی خیانتوں سے ہم آج اس مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں خدا کی یہ تنبیہہ آنے والے خطرات سے ہمیں پکار پکار کر آگاہ کر رہی ہے۔

فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ۔ (۵۴/۱۵)

کیا کوئی ہے جو اس نوشتۂ دیوار سے عبرت حاصل کرے؟

اگر نہیں، تو پھر یاد رکھو کہ: ؎

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

قرآنی قوانین

پرویز صاحب نے قرآنی قوانین کا ضابطہ مرتب کر کے، قوانین ساز حضرات اور اداروں کی مشکل حل کر دی ہے ——— کتابت۔ طباعت، دیدہ زیب۔ سفید عمدہ کاغذ۔ سنہری جلد۔ ——— قیمت۔ بیس (۲۰/-) روپے (علاوہ محصول ڈاک) ——— ملنے کا پتہ: ———

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

حقائق و عبر و مراسلات

۱- بینکاری کا مسئلہ حل ہو گیا

ہمارے زمانے میں اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ اس قدر اہم کہ سیاست بھی اس کے تابع ہے۔ اقتصادیات میں سرفہرست بینکاری ہے اور بینکاری کا دارومدار سود پر ہے۔ ہمارے ہاں جب اقتصادیات کو "مسلمان کرنے" کا سوال سامنے آیا تو اس باب میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ بینکوں کو بلا سود کیسے چلایا جائے؟ اس پر بہت کچھ کہا گیا۔ بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن کوئی بات بنتی دکھائی نہ دی۔ چونکہ ساری دنیا میں مشہور کیا گیا تھا کہ اس مسئلہ کا حل اسلام پیش کرتا ہے اس لئے اقوام عالم بڑی بے تابی سے منتظر تھیں کہ دیکھیں اسلام اس کا حل کیا بتاتا ہے۔ ایک عرصہ کی کد و کاوش کے بعد بانی جماعتِ اسلامی، مودودی صاحب نے، اس مسئلہ کا حل پیش کر دیا۔ پاکستان ٹائمز کے نمائندہ نے ان سے اس مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:۔

سماجی اور اقتصادی ترقی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ بلا سود اقتصادی نظام کا نفاذ ہے۔

اس طرح ترقی کے فوائد سے عوام براہِ راست مستفیض ہوں گے۔

انہوں نے بلا سود بینکاری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

روپیہ جمع کرانے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے اقتصادی منصوبے تیار کریں گے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حقدار ہوں گے اور یہ بینکوں کا اپنا مفاد ہوگا کہ وہ دیکھیں کہ جو بھی اقتصادی منصوبہ تیار ہو وہ نفع بخش اور قابلِ عمل ہو۔

(ایشیا - ۱۵ نومبر ۱۹۷۸ء)

یعنی اس وقت بینک جو کچھ سود کے نام سے دیتے ہیں، اسے منافع کہہ دیا جائے تو یہ اسلامی ہو جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اگر رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا جائے تو وہ مسلمان بن جائے گا!

دیکھا آپ نے، ایسے لاینحل سوال کا کیا آسان جواب عطا ہو گیا!

(۰)

۲- ایک اہم سوال

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:۔

مفتی محمود صاحب نے مودودی صاحب کے خلاف جو فتویٰ صادر فرمایا تھا اس میں انہوں نے کہا تھا کہ مودودی صاحب امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔

مفتی صاحب سے دریافت طلب بات یہ ہے کہ اگر آپ کا یہ الزام صحیح ہے تو ایک امریکن ایجنٹ کے ساتھ آپ کے اتحاد اور تعاون کے کیا معنی ہیں؟ کیا ایک امریکن ایجنٹ یہاں نظامِ مصطفےٰ قائم کرے گا؟

اور اگر مفتی صاحب کا عائد کردہ الزام غلط ہے تو مودودی صاحب سے دریافت طلب بات یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو دوسروں کے خلاف اس قدر سنگین تہمت تراشے، کیا اس قابل ہے کہ اس سے اتحاد و تعاون کیا جائے؟ اور کیا اس کردار کا حامل نظامِ مصطفےٰ قائم کرا دے گا؟

کیا مفتی صاحب اور مودودی صاحب اسلام کے نام پر ان سوالات کا جواب عنایت فرمائیں گے؟

—(۰)—

۳۔ اقامت صلوٰۃ کا مقصد

ایک استفسار:۔

آجکل نماز پڑھنے کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ کیا اس سے صلوٰۃ کا وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے جو قرآن مجید نے بتایا ہے؟

طلوعِ اسلام

قرآن کریم میں اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح آئی ہے۔ اس کے مقاصد کی تفصیل میں جانے سے گفتگو طویل ہو جائے گی۔ بغرضِ اختصار اس کے دو ایک ایسے مقاصد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جس سے متعین طور پر بات سمجھ میں آجائے۔ یعنی ہم محسوس طور پر دیکھ سکیں کہ وہ مقصد حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔

(۱) سورۂ عنکبوت میں ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ۔ (۲۹/۴۵)

یہ یقینی بات ہے کہ صلوٰۃ، بے حیائی کی باتوں اور برائیوں سے روک دیتی ہے۔

یہ معیار بڑا واضح۔ متعین اور محسوس ہے اور بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ مقصد حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔ یعنی کیا ہماری نماز سے برائیوں اور بے حیائی کی باتوں کا خاتمہ ہو رہا ہے؟

(۲) سورۃ الروم میں ہے:۔

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا

دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲)
(اے جماعتِ مومنین تم) اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ ادا کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور اس طرح خود بہت سے فرقوں میں بٹ گئے۔ اس فرقہ بندی سے ہوتا یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر مگن رہتا ہے۔

یعنی اقامتِ صلوٰۃ کا مقصد اور نتیجہ وحدتِ اُمت ہے۔ اگر اُمت میں فرقے ہیں تو یہ شرک ہے۔ اگر نماز سے فرقے نہیں مٹتے تو اس کا قرآنی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

یہ معیار بھی ایسا ہے جس میں نہ کسی قسم کی دشواری پیش آسکتی ہے، نہ ابہام پیدا ہو سکتا ہے۔ نماز پڑھنا بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہماری نمازوں سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔

(۰)

۴۔ ایتاءِ زکوٰۃ

مندرجہ بالا استفسار کا دوسرا حصہ حسبِ ذیل ہے:۔

نماز کی طرح آجکل زکوٰۃ کا بھی بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے اور اس کی شرح کیا۔ کیا ان میں، اور اس کے جو مصارف قرآنِ مجید نے بیان کئے ہیں، ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے؟

طلوعِ اسلام

قرآنِ مجید میں نہ زکوٰۃ کے کسی نصاب کا ذکر ہے نہ شرح کا۔ یہ اس لئے کہ اس کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم ہی کچھ اور ہے۔ اِس وقت یہ سمجھا جاتا ہے کہ حکومت لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتی ہے یا لیتی ہے۔ اور قرآنِ کریم کا ارشاد یہ ہے کہ اسلامی حکومت "زکوٰۃ دیتی ہے"۔ سورۃ الحج میں ہے کہ:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ ... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں ملک میں حکومت اور اقتدار عطا کریں گے تو یہ اقامتِ الصلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

زکوٰۃ لیں گے نہیں، زکوٰۃ دیں گے۔ "زکوٰۃ" کے معنی ہیں سامانِ نشوونما۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرے۔ ——— "ایتاءِ زکوٰۃ" ——— اسلامی مملکت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے مملکت ضروری ذرائع اور وسائل اختیار کرے گی۔

باقی رہے مصارفِ زکوٰۃ، تو وہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں۔ صدقات کے مصارف ہیں۔ سورۃ توبہ میں ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ ..... الخ (۹/۶۰) قرآنِ مجید میں زکوٰۃ کو کہیں صدقات نہیں کہا گیا۔

چونکہ ہم زکوٰۃ اور صدقات کے متعلق متعدد بار تفصیل سے لکھ چکے ہیں اس لئے ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں مختصراً ان کا مفہوم پرویز صاحب کی لغات القرآن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۰)

۵۔ عائلی قوانین

سوال:۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ جب اسلامی قوانین عمل میں آئیں گے تو سب سے پہلے عائلی قوانین میں تبدیلی کی جائے گی۔ چونکہ یہ بہت دیر کی بات ہے جب عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے اس لئے یاد نہیں رہا کہ ان کی نمایاں دفعات کیا تھیں۔ ان کی تصریح کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔

طلوع اسلام

عائلی قوانین کی نمایاں دفعات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ نابالغ لڑکے اور لڑکی کی شادی نہیں ہو سکے گی۔ لڑکی کی کم از کم عمر سولہ سال اور لڑکے کی اٹھارہ سال ہونی چاہیئے۔

۲۔ نکاح کو رجسٹرڈ کرایا جائے گا۔

۳۔ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کیلئے ثالثی کونسل کی اجازت اور پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہوگی۔

۴۔ بیوی کو حق طلاق تفویض کیا جا سکے گا۔

۵۔ کوئی شخص یونہی کھڑے کھڑے جب جی چاہے بیوی کو طلاق نہیں دے سکے گا۔ اس کیلئے مصالحتی کونسل کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اگر یہ کونسل تین ماہ کے اندر مصالحت کرانے میں ناکام رہے تو طلاق ہو سکے گی۔ اسی طرح طلاق کا حق بیوی کو بھی حاصل ہوگا۔

۶۔ اگر خاوند، بیوی کے نان نفقہ میں کوتاہی کرے تو وہ اسے ثالثی کونسل کے ذریعے حاصل کر سکے گی۔

۷۔ جن بچوں کا باپ ان کے دادا کی زندگی میں وفات پا جائے اور وہ اس طرح یتیم رہ جائیں، انہیں دادا کے ترکہ سے وراثت میں حصہ ملے گا۔

یہ ہیں عائلی قوانین کی نمایاں دفعات۔ ہمارے علماء حضرات انہیں منسوخ کرانے کی شروع سے کوشش کر رہے ہیں۔ بالخصوص وہ چاہتے ہیں کہ نابالغوں کی شادی پہ کوئی پابندی نہ ہو۔ چار تک بیویاں کرنے پر کوئی پابندی نہ ہو۔ عورت کو حق طلاق حاصل نہ ہو۔ مرد جب جی چاہے طلاق دیدے۔ اور یتیم پوتوں کو ان کے دادا کے ترکہ سے حصہ نہ ملے۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ ان قوانین کو نافذ ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے اس لئے یہ ذہنوں میں مستحضر نہیں رہے۔ اُس زمانے میں ان کے متعلق ہم نے بڑی تفصیلی بحث کی تھی۔ ہم دیکھیں گے کہ اس بحث کو دوبارہ شائع کر دیا جائے۔

(۰)

اسلام کو علم و بصیرت کی روشنی میں سمجھنے کیلئے کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصوّر پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک (مکمل سیٹ) ۱۲۰ روپے

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں۔ مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار عقل و عشق، فکر و نظر، دل و دماغ کا حسین امتزاج اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مقامِ محمدی اور انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب۔ جلد مضبوط و دلکش۔ قیمت ۴۵/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب، یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع۔ عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت مجلّد ۲۵/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

جہانِ فردا

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ زندگی کن مراحل سے گذرے گی؟ قیامت، حشر، نشر، میزان، جنت، جہنّم کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ اس دنیا کا اس دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ مُردوں کے لئے "ایصالِ ثواب" کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر متعدد سوالات کے بصیرت افروز جوابات۔

قیمت مجلد ۲۵/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کش مکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسیئے نہیں یہ کتاب دیجیئے اور پھر دیکھیئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ قیمت مکمل سیٹ ۳۶/- روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں

وہ منفرد و معلومات افزا کتاب جس کا پہلا ایڈیشن ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا، دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب کی صحیفہ آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں کن مراحل سے گذریں اور اب وہ کس شکل میں ہیں۔ اس کتاب سے جہاں ان مذاہب کے متعلق عجیب و غریب معلومات حاصل ہونگی وہاں مفکرِ قرآن کی وسعتِ مطالعہ اور عمیق تحقیق کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

قیمت مجلد ۱۲/- روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

ملنے کا پتہ: مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار لاہور — ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

سلیم کے نام خط

اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے

پرویز

جب معاشرہ میں بددیانتی اور بدعنوانی عام ہو جائے تو دیانتدار، فرائض شناس اور اصول پرست لوگوں (بالخصوص سرکاری ملازموں) کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ۔۔۔ اور کڑی منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے رفقائے کار (COLLEAGUES) کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انہیں اس قدر تنگ کیا جائے کہ یا تو وہ اپنی اصول پرستی کو چھوڑ کر انہی کی سی روش اختیار کر لیں اور یا پھر ملازمت چھوڑ جائیں ۔۔۔ اسی کش مکش میں بعض لوگ جن کی قوتِ یقین و برداشت کمزور ہوتی ہے، دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا نقصان صرف انہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس قسم کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس طرح صداقت، دیانت اور امانت پر چلنے والوں کا دائرہ دن بدن تنگ ہوتا جاتا ہے۔ یہ سب سے بڑا نقصان ہے جو کسی قوم کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ان کے برعکس، ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس کش مکش میں بڑی پامردی سے اپنے اصولوں پر قائم رہتے اور تمام مشکلات و مصائب کا مقابلہ عزم، ہمت اور استقامت سے کرتے ہیں اور اپنے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش نہیں پیدا ہونے دیتے۔ یہی وہ خوش نصیب حضرات ہیں جن کا کیریکٹر، باطل کی اندوہناک تاریکیوں میں روشنی کے مینار کی طرح جگمگاتا اور مسکراتا ہے اور ہر رہروِ حیات کے لئے یقینِ محکم کا سہارا بنتا ہے۔ یہ وہ سعادت مند ہیں جن کی سیرت کی عمارت قرآنی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ہمارا سرِ نیاز ان کے حضور بصد احترام جھکتا ہے۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں کچھ اسی قسم کے یقین آزما اور ہمت طلب واقعات سامنے آئے جن کے پیشِ نظر، پرویز صاحب نے، اپنے خاص انداز میں "سلیم کے نام ایک خط" میں تصویر کے یہ دونوں رُخ قرآنی آئینے میں پیش کئے اور اس سے فضا میں بڑا خوشگوار اثر پیدا ہوا۔ اس کے بعد یہ خط طلوعِ اسلام بابت مئی سنہ ۱۹[illegible]ء میں شائع ہوا۔ اب جبکہ حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو رہے ہیں احباب کا تقاضا ہے کہ اسے ایک بار پھر شائع کیا جائے اور اس کی اشاعت عام کی جائے۔ پرویز صاحب نے اس خط

۱۔ بعد میں یہ خط "سلیم کے نام خطوط" کے مجموعہ (جلد اوّل) میں شائع ہوا تھا۔

کے آخری حصہ کو بانداز نو تحریر فرمایا ہے جس سے اس کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ خط درج ذیل ہے۔

—(○)—

ہاں تسلیم! مجھے اس انقلاب کا علم ہے، اور تم سے بھی زیادہ علم جو راشد صاحب میں واقع ہوا ہے۔ ان کی تقسیم ہند سے پہلے کی زندگی بھی میرے سامنے ہے اور بعد کی بھی۔ وہ ہندوستان میں بہترین دیانتدار قابل، محنتی اور فرض شناس افسر تسلیم کئے جاتے تھے۔ انگریز تو ایک طرف، ہندو تک بھی ان کی دیانت اور صداقت کے معترف تھے۔ پاکستان آئے تو قوم کی فلاح و بہبود اور ملک کی خدمت کا بے پناہ جذبہ دل میں لئے ہوئے۔ میں بھی اتفاق سے اُسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا جس میں وہ کراچی آئے تھے۔ راستہ بھر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں پاکستان سے عشق تھا۔ اس کی تشکیل پر ان کی جبین نیاز میں بارگاہ ایزدی میں، شکرانے کے ہزاروں سجدے تڑپ رہے تھے۔ وہ اس پہ اس قدر خوش تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کام تو میں نے پہلے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے لیکن اب تو، یہ کام کا کام اور جہاد کا جہاد ہے۔ اب اس محنت میں کچھ اور ہی لذت ملے گی۔ غرضیکہ سارا سفر انہی باتوں میں کٹا۔ ان کے ذہن میں بڑی بڑی اسکیمیں تھیں کہ اب یہ کیا جائے گا اور وہ کیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے پروگرام کے مطابق کام شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں اس کی مثال قائم کر دی کہ محنت اور دیانت۔ فرض شناسی اور احساس ذمہ داری۔ جذبۂ خدمت اور جنون بہبود ملت کسے کہتے ہیں۔ جن حالات میں یہاں دفاتر کے قیام کی ابتداء ہوئی ان کا تمہیں علم ہے۔ نہ میز تھا نہ کرسی۔ نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات۔ نہ کوئی خاص عمارت تھی نہ کمرے۔ کسی کو برآمدے میں جگہ ملی ہے تو وہیں بیٹھ گیا۔ نہیں تو باہر درخت کے سائے میں خیمہ (TENT) لگا لیا۔ رہنے کے لئے جگہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ راشد صاحب اس زمانے میں ڈائریکٹر تھے۔ (اس زمانے کے ڈائریکٹروں کی طرح نہیں تھے کہ ابھی کل کلرک تھے اور آج ڈائریکٹر بن گئے) اس زمانے میں آئی۔ سی۔ ایس کے کافی سینئر افسر ایسی اسامیوں پر تعینات ہوا کرتے تھے) وہ نئی دہلی میں یوں سمجھو کہ ایک محل میں رہتے تھے۔ یہاں انہیں ایک فلیٹ میں ایک کمرہ مل سکا تھا جس میں کل سامان ایک چارپائی تھا۔ انہوں نے چارپائی پر بیٹھے سولہ سولہ گھنٹے روزانہ کام کیا۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے کام کیا۔ ان کا تمام سامان دہلی سے آنے والی گاڑی میں جل گیا اور گھر بار مشرقی پنجاب میں لٹ گیا۔ لیکن ان کی زبان پر شکایت کا ایک حرف تک نہ آیا۔ گورنمنٹ نے کئی بار ان لوگوں سے فہرستیں مانگیں جن کا اس طرح نقصان ہوا تھا لیکن انہوں نے ایک سوئی تک کا مطالبہ نہ کیا۔ حتیٰ کہ اپنے مکان کے بدلے میں کوئی مکان بھی الاٹ نہ کرایا۔ جب بھی اس کا ذکر آتا وہ مسکرا کر کہہ دیتے کہ مجھے تو اللہ نے پھر بھی بہت کچھ دے رکھا ہے یہ انہیں ملنا چاہیئے جن بیچاروں کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ اس آٹھ نو سال کے عرصہ میں ایسی ایسی اسامیوں پر تعینات رہے جن پر اوروں نے لاکھوں روپے بنا لئے تھے۔ لیکن ان کی یہ حالت کہ کیا مجال جو دفتر کی روشنائی سے نجی کی چٹھی تک بھی لکھی ہو۔ ارباب بست و کشاد کو ان کی دیانت پر اس قدر اعتماد تھا کہ جہاں لوٹ

کھسوٹ کا اندھیر مچتا وہاں انہیں پوسٹ کر دیا جاتا۔ اور وہ چند ہی دنوں میں حالات سنوار دیتے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یوں حالات سنوارنے سے خود راشد صاحب کے ساتھ کیا ہوتا؟ تم از خود شاید اس کا اندازہ نہ لگا سکو۔ اس لئے کہ ان امور کا تعلق "رموزِ سلطنت" سے ہے جنہیں تمہارے جیسا "گدائے گوشہ نشین" سمجھ نہیں سکتا۔ تم جانتے ہو کہ اتنے عرصہ کے حالات کی خرابی سے اب دفاتری کاروبار کے چلنے کی صورت کیا ہو چکی ہے — کوئی معاملہ ہو — اس میں حقدار اور غیر حقدار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو شخص رشوت دینا جانتا ہو، جو اثر پیدا کر سکے، جو کہیں سے سفارش لا سکے، جو اوپر سے اشارہ کرا سکے، فیصلہ اس کے حق میں ہو جاتا ہے۔ یہ یہاں کے کاروبار کا عام منہج ہے۔ ایسا عام کہ یہ گویا ایک مسلمہ طریق بن چکا ہے۔ اب راشد صاحب کی یہ کیفیت کہ رشوت دینے والا ان کی کوٹھی کے پاس تک نہ پھٹک سکے۔ ہم عصر افسروں میں سے ایک ایک نے سفارش کر کے دیکھ لیا۔ وہاں کسی کی سفارش کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سیاسی لیڈروں نے (جو رفتہ رفتہ سفارت اور وزارت کی کرسیوں تک بھی جا پہنچے ہیں) اپنے "حکمنامے" بھیج کر ان کے نتائج دیکھ لئے۔ اربابِ حل و عقد نے اپنے "اشاروں" کی ناکامی کے بعد تنگ آ کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر ایک زبان سے ان کی دیانت کی تعریف کرتا۔ لیکن دل سے چاہتا کہ یہ کانٹا کسی طرح بیچ میں سے الگ ہو تو ان کے کاروبار میں آسانیاں پیدا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہم عصر افسروں کو (جو بد دیانت بھی تھے اور نالائق بھی، کاہل بھی اور کام چور بھی) اس کا حسد کہ یہ اپنی دیانت اور محنت کی بنا پر عوام میں مقبول کیوں ہے۔ لہٰذا وہ بھی چاہتے کہ انہیں کسی طرح نیچے گرا دیا جائے۔ جب کسی کی مخالفت میں اتنے عناصر یکجا جمع ہو جائیں تو ہمارے معاشرہ میں محض دیانت اور محنت کس طرح اس کی حفاظت کر سکتی ہے؛ نتیجہ یہ کہ پولیس نے چار بازاری غنڈوں کو اپنے ساتھ ملایا اور راشد صاحب کے خلاف رشوت کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ راشد صاحب کو اس کا زعم تھا کہ تمام افسرانِ بالا اور اربابِ حل و عقد ان کی دیانت سے باخبر ہیں۔ وہ ان کے کہنے پر بیسیوں مرتبہ جلتی آگ میں کود سے اور وہ کچھ کر کے دکھایا جو کسی کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے سمجھ لیا کہ دو چار آدمیوں کی شرارت ان کا کیا بگاڑے گی؟ لیکن تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ان سب نے ایک دم آنکھیں پھیر لیں۔ اور راشد صاحب نے چند ہی دنوں میں محسوس کر لیا کہ اس تصادم میں وہ میدان میں بالکل تنہا کھڑے ہیں۔ چنانچہ ان پر چاروں طرف سے بلاؤں نے ہجوم کر دیا۔ ملازمت سے معطل (SUSPEND) ہو گئے تو روٹی تک کے لالے پڑ گئے۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے ہزاروں روپے درکار تھے، وہ کہاں سے آتے؛ جب کرسی سے الگ ہوئے تو قریب ترین دوستوں اور ماتحتوں نے رسمی ملاقات تک چھوڑ دی۔ "رشوت کے الزام" سے معاشرہ کی نظروں میں خود بخود مجرم قرار پا گئے اور ساری عزت اور شہرت خاک میں مل گئی۔ وہ جدھر سے نکلتے لوگ ان سے آنکھیں چراتے۔ حتیٰ کہ انہیں یہ بھی محسوس ہونے لگ گیا کہ اگر کل کو اس کی نوبت آ گئی تو شاید کوئی ضمانت دینے والا بھی نہ ملے۔

یہ تھے وہ نامساعد حالات جن میں گھرے ہوئے راشد صاحب اس شام میرے ہاں آئے تھے جس کا میں

نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ان کی پریشانی اسی سے ظاہر تھی کہ وہ پہلے بہت کم سگریٹ پیتے تھے لیکن اب کش پر کش لگائے چلے جاتے تھے۔ تم جانتے ہو میرے دل میں ان کے لئے کتنا احترام ہے اس لئے میری ساری ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں اور ہوتی کیوں نہ، جب میں جانتا تھا کہ وہ کس قدر مظلوم اور بیگناہ ہیں۔ لیکن میرے لئے ان کی مصیبت سے کہیں زیادہ پریشان کن بلکہ صدمہ کا باعث ان کا وہ ردِ عمل تھا جو ان حالات کے خلاف ان کے دل سے اُبھر رہا تھا۔ انہوں نے پورے جوش اور شدت سے اپنی داستان کو دہرایا اور ایک ایک شخص نے (جس پر انہیں اس قدر بھروسہ تھا) ان سے جس طرزِ عمل کا ثبوت دیا، اسے اس لہجہ سے بیان کیا جس میں مایوسی اور رنج سے کہیں زیادہ غصہ اور انتقام کی جھلک پائی جاتی تھی۔ میں سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کس قدر زخمی دل کی چیخ و پکار ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے جگر کے پار ہوتا جا رہا تھا۔ جب ان کے جذبات میں زیادہ ہیجان پیدا ہو گیا تو میں نے کچھ کہہ کر انہیں تسلی دلانے کی کوشش کی۔ میں نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ انہوں نے مجھے ٹوک کر کہا کہ :-

معاف کیجئے پرویز صاحب! آپ ایک خیالی دنیا میں بستے ہیں۔ میں اپنے عمر بھر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دیانتداری اور حق و صداقت کے لئے اس دنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس سکہ کا اس بازار میں چلن ہی نہیں۔ انہیں اپنا اصول بنا کر دنیا میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کا ایک ایک ورق آپ کے سامنے ہے۔ میں نے پاکستان کے لئے، مسلمانوں کے لئے اور ان "بڑی بڑی سرکاروں" کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن مجھے اس دیانت و صداقت، اس محنت اور جاں فشانی کا صلہ کیا ملا؟ یہی کہ جگہ جگہ کے کتے میرے پیچھے چھوڑ دیئے گئے اور جن کی خاطر میں نے یہ سب کچھ کیا ہے، ان میں سے کسی میں اتنی مروّت بھی نہیں کہ انہیں محض زبان سے دھتکار ہی دے۔ اس کے بعد آپ مجھے دیانت اور امانت کا کیا وعظ سنائیں گے! آپ محض وعظ سناتے ہیں اور میں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اب میرے سامنے زندگی کا صحیح نقشہ آ گیا ہے۔ اب آپ راشد کو ایک مختلف انسان پائیں گے۔ اُف!

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ (IN ROME DO AS ROMANS DO) چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ دنیا میں رہنے کا یہی ڈھنگ ہے۔

وہ یہاں تک کہنے پائے تھے کہ باہر سے ایک اجنبی آ گیا اور یہ سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا۔ یہ ہیں راشد صاحب کے وہ تاثرات جن کی بناء پر تم بھی کہتے ہو کہ وہ حق بجانب ہیں اور ہمارے پاس انکی شکایات کا کوئی

جواب نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شکایات حق بجانب ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں، جو صداقت اور دیانت کی اقدار کا قدردان ہو، ان کی بے لوث خدمات کا صلہ کچھ اور ہونا چاہیئے تھا لیکن اس سے وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، اس سے میں متفق نہیں۔ میں ان کے اس ردِّ عمل کو غلط سمجھتا ہوں۔ ایسا غلط کہ مجھے اس کا سخت صدمہ ہے۔ مجھے پہلے اس بات کا افسوس تھا کہ ان ناعاقبت اندیش اربابِ بست و کشاد نے اپنی لاابالی سے ایک عمدہ افسر کو ہاتھ سے کھو دیا۔ لیکن راشد صاحب کے ان تاثرات کے بعد مجھے اس کا رنج ہوا کہ ایک عمدہ افسر ہی نہیں انہوں نے ایک قیمتی انسان کو ضائع کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی افسوس تھا کہ راشد صاحب ایک ہی دھچکے میں کہاں سے کہاں آ گرے! خدا کرے، ان کا یہ ردِّ عمل ہنگامی اور عارضی ہو اور وہ اس کے بعد پھر سنبھل جائیں۔ مجھے ان سے اس کی توقع تو بہت ہے، آئندہ خدا جانے!

(۰)

اب میں تمہارے اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ ایسے مقامات میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اور ان دھچکوں سے بچنے کی کیا صورت بتاتا ہے۔ (واضح رہے کہ جو کچھ میں اب کہنے والا ہوں اسے میں نے مختلف نشستوں میں راشد صاحب کے کان میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ یہاں نہیں۔ خدا کرے کہ انہوں نے اس کا اثر لے لیا ہو۔ بہرحال تم غور سے سنو!) قرآن، سلیم! انسان کو اتنا اونچا لے جاتا ہے کہ وہ ان دھچکوں کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کو سکھاتا یہ ہے کہ وہ آئینِ وفا کو اس لئے اختیار نہ کرے کہ اسے اس کا "نخوت پرستوں" کی طرف سے کچھ صلہ ملے گا۔ وہ وفا کو وفا کی خاطر اختیار کرے۔ اس کے لئے اس نے ایک ایسا گُر بتایا ہے جو لفظی اعتبار سے جس قدر سمٹا ہوا ہے، معنوی اعتبار سے اسی قدر پھیلا ہوا ہے۔ وہ گُر یہ ہے کہ تم جو کام بھی کرو لِلّٰہ (اللہ کیلئے) یا فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہ الفاظ سن کر جی میں کہو گے کہ میں نے یہ کیا "مولویانہ" سی بات کہہ دی! تم ایسا خیال کرنے میں سچے ہو، اس لئے کہ ہمارے مروّجہ مذہب میں یہ الفاظ اپنی حقیقت سے دُور ہٹ کر ایسے "عامیانہ" سے ہو گئے ہیں کہ انہیں سُن کر ذہن کسی بلند تصوّر کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن سلیم! سچ جانو کہ یہ الفاظ انسانی تصوّر و تخیل کو ان بلندیوں تک لے جاتے ہیں جن سے آگے کوئی اور بلندی نہیں۔ یہ مختصر سے الفاظ بہت بڑی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

حضرات انبیاء کرام ع کی جو داستانیں قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، تم ان پر نگاہ ڈالو۔ تمہیں نظر آئے گا کہ وہ دوسروں کو تباہی سے بچانے کی خاطر طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتے۔ جانکاہ مشقتیں برداشت کرتے۔ وہ لوگ ان کی سخت مخالفت کرتے۔ انہیں بدنام کرتے۔ سخت سست کہتے۔ اذیتیں پہنچاتے۔ حتیٰ کہ انہیں گھر بار چھوڑنے تک پر مجبور کر دیتے اور بعض اوقات ان کے خلاف میدانِ جنگ میں بھی اتر آتے۔ وہ یہ سب کچھ کرتے لیکن اس کے ردِّ عمل میں یہ حضرات دل برداشتہ ہو کر

اور یہ کہ کر انہیں ان کے حال پر نہ چھوڑ دیتے کہ یہ اگر تباہی سے بچنا نہیں چاہتے تھے اور اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر ہی تلے بیٹھے ہیں تو ہلاک ہوتے پھریں۔ میں کوئی ان کا ٹھیکیدار ہوں کہ ان کی خاطر اتنی مصیبتیں جھیلتا پھروں۔ وہ اس کے برعکس ان کی تباہی کے احساس سے خون کے آنسو روتے اور ان کے غم میں اپنی جان ہلکان کر لیتے۔ قرآن کریم نے خود نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے کہ......

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ (۱۸/۶)

"ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، اپنے آپ کو ہلاک کر لے گا" (نیز ۲۶/۳) دوسری جگہ ہے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ۔ (۳۵/۸) "تم ان کے غم میں اپنی جان تو نہ گنواؤ"؛ تم سوچو سلیم! کہ وہ جو ان کی خاطر اس طرح اپنی جانوں کو گھلاتے تھے، تو انہیں اس سے کیا ملتا تھا؟ کوئی معاوضہ تو ایک طرف، وہ ان کا شکریہ تک ادا نہیں کرتے تھے ——— شکریہ ادا کرنا کیا، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ ان کی جان تک کے لاگو ہوتے تھے۔ تم سوچو کہ یہ حضرات ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس کے جواب کے لئے تم قرآن میں بیان کردہ ان کے تذکارِ جلیلہ کو دیکھو۔ ان میں سے ہر ایک کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ:۔

مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ۔ (۲۶/۱۰۹)

میں تمہاری بھلائی کی خاطر اپنی ان جگر گدازیوں اور دل سوزیوں کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میں کسی اجر کا متمنی نہیں۔ اس میں "اَسْئَلُكُمْ" کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی میں تم سے "کوئی اجر نہیں مانگتا ——— یہ نہیں کہ میں اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتا ——— نفسیاتی طور پر یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کسی کام کے لئے آمادہ ہو جائے جب تک اس کا کوئی جذبۂ محرکہ نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جذبۂ محرکہ اس کے کسی مقصد کا حصول ہوگا۔ اسی کو اس کام کا اجر یا صلہ کہتے ہیں۔ سو اجر یا صلہ کی تمنا اور توقع کے بغیر کوئی کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے ان حضرات (انبیائے کرامؑ) کا اعلان یہ ہوتا تھا کہ "میں اپنے اس کام کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا"۔ یہ نہیں کہ میں اس کام کا کوئی معاوضہ چاہتا ہی نہیں۔ میں اس کا معاوضہ چاہتا ہوں، لیکن تم سے نہیں چاہتا۔ تم سے نہیں مانگتا۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶/۱۰۹)

میں اپنا اجر، صلہ، معاوضہ، اس خدا سے چاہتا اور مانگتا ہوں جو ربّ العالمین ہے۔

یہ وہی بات ہے جسے میں نے پہلے لکھا ہے ——— یعنی میں یہ کام، تمہارے لئے کر ہی نہیں رہا جو تم سے اس کا معاوضہ طلب کرنے لگوں۔ جس کے لئے میں یہ کام کر رہا ہوں، وہی مجھے اس کا معاوضہ دے گا۔ اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

انسانی زندگی کے متعلق ایک تصور تو یہ ہے کہ اس کی زندگی، اس کے طبیعی جسم سے عبارت ہے اور بس! فطرت کے طبیعی قوانین کے مطابق یہ وجود میں آجاتا ہے۔ انہی قوانین کے مطابق اس کی پرورش اور نشو و نما ہوتی رہتی ہے، اور انہی کے مطابق آخر الامر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ مر جاتا ہے تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس تصورِ حیات کی رُو سے، انسان کے ہر کام کا معاوضہ طبیعی شکل میں ملنا چاہیئے۔ اگر معاوضہ اس شکل میں مل جائے تو کام کرنے والا مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر نہیں ملتا تو وہ دل برداشتہ ہو کر، کام چھوڑ دیتا ہے۔ جس مزدور کو مزدوری نہ ملے، وہ کام پر نہیں جائے گا۔ وہ کہے گا کہ اُجرت کے بغیر کسی کا کام کئے جانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

زندگی کا دوسرا تصوّر یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ یہ ذات نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہوتی ہے، نہ اس کی نشوونما طبیعی اسباب و ذرائع سے ہوتی ہے۔ نہ ہی طبیعی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے چلتی ہے۔

لیکن طبیعی جسم کی طرح اس کی ذات کی نشوونما بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ طبیعی جسم کی نشوونما، طبیعی اشیاء (کھانے پینے وغیرہ) سے ہوتی ہے لیکن اس کی ذات کی نشوونما ان اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس مقصد کے لئے متعین فرمایا ہے۔ انہیں عام طور پر اخلاقی اقدار (ETHICAL VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق کام کرنے کو "خدا کے ہاں سے صلہ یا اجر ملنا" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجر نہ کہیں خارج سے ملتا ہے، اور نہ ہی اس کی کوئی محسوس شکل ہوتی ہے۔ اس کا اجر خود اس کام کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ اس عظیم حقیقت کو قرآنِ کریم نے دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے جب کہا کہ: هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۷/۹۰) جو کچھ تم کرتے ہو وہی اس کا بدلہ ہوتا ہے۔ یعنی اس کام کا بدلہ خود اس کام کے اندر پنہاں ہوتا ہے۔ کہیں باہر سے نہیں ملتا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا کرتا ہوں۔ تم کسی قلی (یا مزدور) سے کہتے ہو کہ وہ تمہارا خط تمہارے دوست تک پہنچا دے جس کا مکان دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے لئے اسے ایک روپیہ ملے گا۔ اس قلی کو نہ تمہارے خط سے کوئی واسطہ ہے، نہ ہی اس دو میل کی مسافت سے کوئی تعلق۔ اس نے تمہارا کام کیا اور اس کے بدلے میں اسے ایک روپیہ مل گیا۔ یہ کسی کام کے خارج سے ملنے والے صلہ کی مثال ہے۔ اس کے برعکس، تم صبح سویرے اٹھ کر دو میل کی سیر کرتے ہو تو اس لئے نہیں کہ اس کے بدلے میں تمہیں کہیں سے ایک روپیہ ملے گا۔ تم یہ اس لئے کرتے ہو کہ اس سے تمہاری صحت اچھی ہوگی۔ یعنی سیر کے سلسلے تمہارا دو میل کا سفر اپنا صلہ خود اپنے اندر رکھتا ہے ——— یہ جزاء، مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ کی مثال ہے۔ یعنی اس میں کام کا صلہ اس کے اندر مضمر ہوتا ہے۔

اقدارِ خداوندی کے مطابق جتنے کام کئے جاتے ہیں، ان کا صلہ خارج سے نہیں ملتا۔ ان کا صلہ خود ان کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آخر الامر ان کا صلہ طبیعی مفاد کی شکل میں بھی سامنے آ جاتا ہے، لیکن ان اقدار کی پابندی کرنے والوں کا جذبۂ محرکہ طبیعی مفاد کا حصول نہیں ہوتا ——— طبیعی مفاد کی شکل میں ان کا صلہ مل جانے کے متعلق یوں سمجھو کہ جب، ان اقدار کی پابندی کرنے والے، ایک نظامِ معاشرہ قائم کر لیتے ہیں تو اس کے نظام کے جنت بداماں نتائج ان کی طبیعی زندگی کو بھی خوشگوار اور شاداب بنا دیتے ہیں اور انہیں ہر قسم کی

سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہو جاتی ہیں ۔ جس طرح جب سیر کرنے والے کی صحت اچھی ہو جائے تو اس کی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اسے پھر سُن لو کہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کو آخرالامر طبیعی زندگی کی خوش سامانیاں حاصل ہو جاتی ہیں ۔ لیکن وہ ان اقدار کی پابندی، ان خوش سامانیوں کی خاطر بھی نہیں کرتے ۔ وہ ان کی پابندی اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی جاتی ہے ۔ یہ معنے ہیں ان کے اس اعلان کے کہ ہم یہ کچھ کسی خارجی صلہ کی خاطر نہیں کرتے ۔ "خدا کی خاطر" کرتے ہیں ۔ حضرات انبیاء کرامؑ کا مقام تو بہت بلند ہے ۔ ان کے اتباع میں، ان اقدار کی پابندی کرنے والے مؤمنین کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو سامانِ زیست (رزق) بہم پہنچاتے ہیں ۔ ان کی مدد کرتے ہیں ۔ تو اس کے ساتھ ان سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ : اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ـــــ ہم یہ سب کچھ "خدا کی خاطر" کرتے ہیں ۔ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۔ (۷۶/۹) ۔ "ہم اس کے عوض تم سے کسی صلہ کے تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں" یہ اس لئے کہ ضرورت مندوں کو سامانِ رزق مہیا کرنا، ایک قدر ہے ۔ لہٰذا جو شخص اس کے مطابق کچھ کرتا ہے وہ ان ضرورت مندوں سے اس کا معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک بھی نہیں چاہتا ۔ ان معذورین کی پرورش، اس کا فریضہ تھا ۔ ان کی پرورش ہو گئی تو اسے اس کا صلہ مل گیا ۔

اس مقام پر ایک اور لطیف سا نکتہ بھی سمجھ لو ۔ قرآن کریم میں ہے هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵/۶۰) ۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا اور مفہوم لیا جاتا ہے کہ تم نے کسی پر اس کی ضرورت کے وقت کوئی احسان کیا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تم پر احسان کر کے تمہارے احسان کا بدلہ اتارے ـــ یعنی احسان کرنے کے بعد، تم منتظر رہو کہ وہ کب تمہارا احسان اتارتا ہے ! یہ خود غرضی کی انتہا ہے ۔ اس سے تمہارا احسان مند اس وقت تک تمہارے سامنے سرنگوں رہے گا جب تک وہ اس بارِ احسان سے سبکدوش نہ ہو جائے ۔ یہ اس ارشادِ خداوندی کا صحیح مفہوم نہیں ـــ احسان کے معنے ہوتے ہیں کسی کی کمی دُور کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا اور اس طرح اس کا حُسن واپس دلا دینا ۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کرنا چاہا ۔ وہ برقرار ہو گیا ۔ تمہیں تمہارے کام کا صلہ مل گیا ۔ تم جو چاہتے تھے وہ ہو گیا ۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟ تم نے دیکھا کہ خدمت بلا صلہ کا یہ کیسا عظیم اور بلند تصوّر ہے ۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اقدارِ خداوندی کا اتباع کسی خارجی صلہ کی غرض سے نہیں بلکہ محض اس لئے کرے کہ اس سے اس کی ذات میں حسن پیدا ہو جائے گا ۔ اس قسم کا صلہ، جنت کا وہ چشمہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے ۔ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۷۶/۶) ۔ وہ اسے اپنے قلب کی گہرائیوں سے بہا کر لائیں گے ۔ یہ کہیں باہر سے بہتا ہوا نہیں آئے گا ۔ یہ وہ حقیقتِ عظمیٰ ہے جسے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ان جامع الفاظ میں کہلوایا گیا کہ :-

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (۶/۱۶۲ ـ ۱۶۳)

تو کہہ دے کہ میرے فرائضِ حیات اور ان کے حصول کے طور طریقے۔ (مختصر الفاظ میں یہ کہ)
میری زندگی، میری عبادت، میری موت سب اللہ کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کی نشوونما کا ذمہ دار ہے۔
میرے اس مقصد میں کسی اور جذبہ کی آمیزش نہیں۔ مجھے اسی مسلک کے اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہوں۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے ایک مسلم کی زندگی۔ یعنی اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ لیکن ایسا کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کو خود اپنے مفاد پرستانہ جذبات کے ساتھ جنگ کرنی پڑتی ہے جو ہر آن طبیعی مفادات کے تقاضے کرتے رہتے ہیں خواہ ان کے لئے کوئی سا حربہ بھی استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔ اپنی اندرونی جنگ سے آگے بڑھیئے تو اس معاشرہ کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے جس میں باطل کا نظام کارفرما ہوتا ہے۔ یہ جو ہم نے دیکھا ہے کہ حضرات انبیاء کرام ؑ کی سخت مخالفت ہوتی تھی تو یہ درحقیقت ان کے پیش کردہ اقدار پر مبنی نظام کی، باطل کے نظام کے ساتھ جنگ تھی جس کے پیشِ نظر صرف انسان کے طبیعی مفاد ہوتے ہیں۔ اقدار کا تصور نہیں ہوتا۔ اسے قرآن کے الفاظ میں،

حق و باطل کی جنگ

حق اور باطل کی جنگ کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ بڑی صبر آزما اور ہمت طلب ہوتی ہے کیونکہ باطل نظام کے پاس مخالفت کے وسیع ذرائع اور نہایت مؤثر اسباب ہوتے ہیں، اور اقدار کی دعوت دینے والا، ایک تو شروع میں تنہا ہوتا ہے اور دوسرے، اس کے پاس وہ سامان اور ذرائع بھی نہیں ہوتے۔ اس کی قوت کا راز اس یقین (ایمان) میں ہوتا ہے کہ باطل لاکھ قوتوں کا مالک ہو، آخر الامر فتح حق کی ہوگی۔ اس نکتہ پر قرآن کریم کے ارشادات بڑے واضح ہیں۔ سورۃ الانبیاء میں ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ (21/18) اس کش مکش میں خدا کا قانونِ مکافات، باطل کے سر پر حق کے ہتھوڑے مارتا رہتا ہے تاآنکہ وہ باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے اور اس طرح باطل میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ اس لئے کہا کہ جس طرح تاریکی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک روشنی نہیں آجاتی، اسی طرح باطل بھی اسی وقت تک غالب رہتا ہے جب تک حق نہیں آجاتا۔ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ جونہی حق آتا ہے باطل بھاگ جاتا ہے۔ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (17/81) باطل کی تو فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ حق کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔

لیکن جو شخص حق کو لے کر اٹھتا ہے۔ یعنی خود بھی اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے، اسے بڑی ہمت اور برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر وہ راستے میں ہمت ہار دیتا ہے تو پھر اسے حق پرست نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کر دیا کہ: إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا...... جو لوگ اس داعیہ کے ساتھ اٹھے کہ سامانِ ربوبیت خدا کی ملکیت میں رہنا چاہیئے۔ انسانوں کی ملکیت میں نہیں۔ اور پھر اس دعوت اور مسلک پر جم کر کھڑے ہو گئے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوگا جو ان سے کہیں گے

کہ: اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ تم نہ کسی سے ڈرو، اور نہ ہی دل برداشتہ ہو کر ہمت ہارو۔۔۔ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱/۳۰) مستقل اقدار کی پابندی کے نتیجے میں خدا نے تم سے جس جنتی زندگی کا وعدہ کر رکھا ہے وہ آکر رہے گی۔ تم اس تصادم اور کشمکش میں تنہا نہیں ہو۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ۔ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے دوست اور رفیق ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (۴۱/۳۱) اس جنتی زندگی میں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے تم جو چاہو گے ہوگا جو مانگو گے ملے گا۔ بس تھوڑا سا توقف کرو اور ہمت سے کام لو۔

---(٠)---

ان تصریحات کے بعد سلیم! ہم اس بات کی طرف آجاتے ہیں جو راشد صاحب نے کہی تھی۔ یعنی "اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے"۔ دیانتداری اقدارِ خداوندی میں سے ایک قدر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں بددیانتی عام ہو، دیانتداری پر کاربند ہونے والے اور اس کی طرف دعوت دینے والے کی مخالفت بڑی شدت سے ہوگی۔ اس تصادم میں اسے نقصانات بھی اٹھانے پڑیں گے۔ اگر اس نے دیانتداری اس خیال سے اختیار کی تھی کہ یہ پھولوں کی سیج ہے۔ اس پر نہ صرف یہ کہ اسے کانٹا نہیں چبھے گا بلکہ معاشرہ کی طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے بھی برسائے جائیں گے، تو اس کا یہ خیال خام اور مفروضہ غلط تھا۔ اس لئے معاشرہ کی طرف سے مخالف ردِ عمل سے وہ ضرور دل برداشتہ ہو جائے گا اور آخر الامر یہ کہے گا کہ میں نے غلطی کی جو دیانتداری کا شیوہ اختیار کیا۔ میں بھی اگر دوسروں کی روش پر چلتا رہتا تو بڑے مزے میں رہتا۔

لیکن اگر اس نے دیانتداری کی روش اس لئے اختیار کی تھی کہ یہ ایک مستقل قدر ہے جس کا صلہ خود اس کے اندر مضمر ہے۔ خارج سے اس کا کوئی صلہ نہیں ملے گا بلکہ اس کی شدید مخالفت ہوگی اور اس سے مجھے نقصان بھی اٹھانا پڑے گا تو پھر یہ صورت نہیں پیدا ہوگی کہ اس مخالفت سے گھبرا کر انسان یہ کہدے کہ اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے۔ اور اس کے بعد باقی معاشرہ کی طرح بددیانتی کا مسلک اختیار کرلے۔

لہٰذا بنیادی سوال یہ ہوگا کہ آپ دیانتداری کی روش کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کے جواب کے مطابق آئندہ چل کر آپ کا ردِ عمل ہوگا۔ غلط معاشرہ میں صحیح روش اختیار کرنے کے لئے یہی صبر آزما عواقب تھے جن کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اسی "فیصلہ" کو زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کہتے ہیں، اور انسان کے ردِ عمل کا دارومدار اسی تبدیلی پر ہے ۔۔۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

نوع دیگر بیں، جہاں دیگر شود ایں زمین و آسمان دیگر شود

نگاہ کی تبدیلی سے انسان کے نفع و نقصان کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ اس وقت سوال یہ رہ جاتا ہے کہ نقصان جسم کا یا ذات کا۔ قرآن کریم نے اس بلند حقیقت کو بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ۔ اے ارباب ایمان! تم اپنی ذات کے تحفظ، نشوونما اور استحکام کا خیال رکھو۔ یاد رکھو۔ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (۵/۱۰۵)۔ اگر تم صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے تو غلط راستے پر چلنے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ وہ جو نقصان بھی پہنچائیں گے اس کا تعلق تمہاری طبیعی زندگی سے ہوگا۔ تمہاری ذات کو کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسے تم خود ہی نقصان پہنچا سکتے ہو۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا کہ: كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ۔ غلط راہوں پر چلنے والے خود اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں پہنچاتا۔ لہٰذا، اگر تمہارا مقصودِ حیات اپنی ذات کی منفعت ہے تو غلط بیں معاشرہ تمہیں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا۔ اس راہ میں تو جس قدر طبیعی نقصانات پہنچیں گے، وہ تمہاری ذات کے لئے اسی قدر منفعت بخش ہونگے۔ طبیعی نقصانات کا آخری درجہ جان کا نقصان ہے۔ اقدار کے تحفظ کی خاطر جان دے دینے سے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے۔ انسانی ذات کا اس سے زیادہ نفع اور کیا ہو سکتا ہے؟ اقدار کا تحفظ چاہنے والا تو ہنسی خوشی جان دے دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے کم درجہ کے نقصانات اسے کس طرح ملولِ خاطر کر سکتے ہیں اور وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ میں نے جو روش اختیار کی تھی وہ حماقت پر مبنی تھی۔ وہ تو ہر طبیعی نقصان پر سجدۂ شکر بجا لائے گا کہ اس سے اس کی ذات کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ یہی ہیں وہ خوش بخت انسان جن کے متعلق خالقِ کائنات نے کہا ہے کہ:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ۔ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (۲/۱۵۵-۵۷)

اس جدوجہد میں بیشتر مواقع ایسے آئیں گے جن میں تمہیں اس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ تمہاری صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہو چکی ہے۔ ٹکراؤ کے بغیر انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر ہی نہیں سکتا (۶۷/۲)۔ اس میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا۔ کہیں سامان خورد و نوش کی کمی ہوگی۔ کہیں مال اور جان کا نقصان ہوگا۔ کہیں کھیت اور باغ اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ لیکن آخر الامر، فتح و کامرانی کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے، اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں ان کی نگاہیں، اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصدِ زندگی، نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ (۹/۶۳) مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا قدم اسی نصب العین کی طرف اُٹھے گا۔ (۹/۵۹) وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔

یہی وہ انقلابی جماعت ہے جو اپنے نشوونما دینے والے کے نزدیک مستحقِ ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ انہیں اس کے قانون کی تائید حاصل ہے۔ (۲۳/۲۲، ۳۳/۵۵) انہیں کے لئے سامانِ نشوونما کی فراوانیاں اور الطاف و اکرام کی بارشیں ہیں۔ اور ان کا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔

(o)

ملخص جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ دیانتداری کی روش وہی اختیار کر سکتا ہے جس کا ایمان ہو کہ:-

۱۔ انسانی زندگی اس کے طبیعی جسم کی زندگی ہی نہیں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسان کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام مؤمن کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔

۲۔ انسانی ذات کی نشوونما اقدارِ خداوندی کی پابندیوں سے ہوتی ہے۔ دیانتداری بھی انہی اقدار میں سے ایک قدر ہے۔

۳۔ باطل معاشرہ میں اقدارِ خداوندی کی متابعت کرنے والے کو ہر طرح کی مخالفت سے سابقہ پڑے گا۔ اسے مختلف قسم کی تکالیف اور پریشانیاں برداشت کرنی ہوں گی۔ نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ اگر وہ اپنی روش پر مستقل مزاجی سے جم کر کھڑا رہا تو آخر الامر کامیابی اسی کی ہوگی۔ اس میں وقت تو ضرور لگے گا لیکن آخر کار حق غالب آکر رہے گا۔ یہ خدا کا وعدہ اور اس کا اٹل قانون ہے۔

جو شخص ان امور پر یقین محکم رکھے گا، دیانتداری کی روش میں ثابت قدم رہ سکے گا۔ لیکن جو شخص اس روش کو یا تو محض روایتی طور پر اختیار کرتا ہے۔ یا اس لئے کہ اس سے وہ "نیک آدمی" مشہور ہو جائے گا اور معاشرہ میں واہ واہ ہوگی تو چند ہی قدم چل کر اسے نہایت تلخ تجربہ ہوگا اور وہ مخالفتوں اور نقصانات سے گھبرا کر پکار اٹھے گا کہ میں نے دیانتداری کی روش اختیار کر کے غلطی کی۔ اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے۔

(o)

یہ تھی سلیم! وہ قرآنی تعلیم جسے میں وقتاً فوقتاً راشد صاحب کے گوش گذار کرتا رہا، اس توقع کے ساتھ کہ چونکہ ان کے سینے میں قلبِ سلیم ہے اس لئے وہ وقتی جذبات کے ہیجان کے فرو ہو جانے کے بعد جب اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو وہ اس سے ضرور اثر پذیر ہوں گے، تم یہ سن کر خوش ہو گے کہ میری یہ توقع موہوم ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد ان کا ایک خط موصول ہوا جسے تمہاری اطلاع کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ تمہیدی فقرات کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس دن آپ کی بات کو عجیب بے ہنگم طریق سے کاٹ دیا اور اس کے بعد بھی آپ وقتاً فوقتاً جو کچھ کہتے رہے اسے بھی بے رغبتی اور بے التفاتی ہی سے سنتا رہا۔ میں اس کے لئے اس سے زیادہ اور کسی معذرت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں ان دنوں

جن حالات سے گذر رہا تھا، ان میں جذبات پر قابو رکھنا میرے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ بالآخر دل ہی تو تھا نہ سنگ وخشت۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی میری کمزوری تھی۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ جو کچھ آپ مجھ سے وقتاً فوقتاً کہتے رہے اسے اگرچہ میں نے بے التفاتی سے سنا لیکن وہ غیر شعوری طور پر میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا اور اب جبکہ ان جذبات کا طوفان تھم گیا ہے، ان کی صداقت ایک ایک کرکے میرے سامنے آ رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی جو کچھ کیا تھا کسی ستائش کی تمنا یا صلہ کی امید سے نہیں کیا تھا۔ اب میں اس جگر خراش واقعہ کے بعد بھی، آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسی مسلک پر قائم رہونگا۔ اس حادثہ میں جن دوستوں نے مجھ سے ہمدردی کا ثبوت دیا، میں ان سب کا سپاس گذار ہوں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق آپ ہیں، اس لئے کہ آپ نے اس دشوار گذار راستہ میں میرا ہاتھ اس طرح تھاما کہ اس نے میرے پاؤں میں لغزش نہیں پیدا ہونے دی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو (یہ حادثہ تو گذر ہی جاتا لیکن) میں ایک مختلف انسان ہو جاتا اور یہ نقصان ایسا ہوتا جس کی تلافی کسی صورت میں بھی ممکن نہ تھی۔ آپ کا یہ احسان بہت بڑا احسان ہے اور اس سے بھی زیادہ بڑا احسان یہ کہ اس ضمن میں آپ نے جن قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا، ان سے میرا یہ مسلک علیٰ وجہ البصیرت مسلکِ حق وصداقت قرار پا گیا۔

مجھے راشد صاحب سے اسی کی توقع تھی۔ کس قدر بلند ہیں یہ انسان جو قرآن کا اثر اس طرح سے لیتے ہیں۔ قرآن فی الواقعہ ایسا ہی انقلاب پیدا کرتا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اور قرآن کی رُو سے ہر عمل کا محور، یہی نقطہ، توحید ہے کہ جو کچھ کیا جائے للہٰ کیا جائے۔ یعنی اقدارِ خداوندی کی متابعت کے لئے۔ اس میں نہ کسی معاوضہ اور ستائش کا خیال جذبۂ محرکہ ہونا چاہیئے نہ ہی کسی شخصیت کا پاس، خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

سوچو سلیم! کہ کس قدر جنت بداماں ہوگا وہ معاشرہ جس میں فرائض کی انجام دہی کا مرکز یہ تصور ہو، اور نوعِ انسانی کے لئے کس قدر باعثِ رحمت۔ اور پھر اس پر بھی غور کرو کہ ایک زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے کس طرح خارجی دنیا میں انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ زاویۂ نگاہ کی اس تبدیلی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ ہر عمل کی بنیاد ایمان پر رکھتا ہے تاکہ یہ عمارت اس قدر محکم ہو کہ خارجی حوادث اس پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اب تم سمجھے کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور اس کا عمل سے کیا تعلق ہے؟

والسلام

پرویز

ـــــ (۰) ـــــ

- انسان کا سب سے اہم مسئلہ معاش کا ہے۔
- یہ مسئلہ ویسے ہی مشکل تھا لیکن ہمارے زمانے میں اس نے خاص طور پر اہمیت اختیار کر لی ہے۔
- ہمارے قدامت پرست طبقہ نے رسمی طور پر کہنا شروع کر دیا کہ اسلام نے اس کا اطمینان بخش حل بتایا ہے۔

لیکن کسی نے متعین طور پر نہیں بتایا کہ وہ حل ہے کیا! مفکرِ قرآن، پرویز صاحب نے، اپنی نہایت اہم کتاب :———

نظامِ ربوبیّت

میں اس کا قرآنی حل پیش کیا جس نے فکری حلقہ میں انقلاب برپا کر دیا۔

یہ کتاب، ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھی لیکن اس کے بعد اقتصادیات کے متعلق نئے نئے مسائل چھڑتے اور نئی نئی مشکلات سامنے آتی رہیں۔ اب پرویز صاحب نے ان تمام مسائل کو سامنے رکھ کر اس کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا ہے جسے معاشیات کے موضوع پر مستند صحیفہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں مارکس کے ساتھ تقابل بھی ہے اور ماؤزے تنگ کے ساتھ بھی۔ صنعتی نظام کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے اور (نام نہاد) "اسلامی سوشلزم" کا بھی۔ زکوٰۃ پر بھی بحث کی گئی ہے اور ربوٰا پر بھی۔

کتاب قریب سوا چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اعلیٰ سفید ولایتی کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ عنقریب مکمل ہو کر پریس سے آجائے گی۔ قیمت کا فیصلہ کتاب مکمل ہونے پر کیا جا سکے گا۔

چونکہ کتاب کی مانگ بہت زیادہ ہے اس لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ شائع ہونے پر یہ بلاتاخیر آپ تک پہنچ جائے تو آپ اپنی فرمائش ابھی سے بھیج دیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲، لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT RD.
LONDON, E-13 — 9NR.
PHONE 01-552-1517.

لاہور میں ہر جمعہ ۹½ بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب - عابد سلک انڈسٹریز
(فون 30890) عقب اڈہ لاریاں - مائی دی جھگی

کراچی ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۳½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت - گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان - آغا محمد یونس صاحب - رفیقی لین صدر - بالمقابل ڈی پی آئی مین گیٹ - پشاور سٹیڈیم - باڑہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی بھیمبر روڈ - (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
برمکان ڈاکٹر رضا محمد خاں - نواب علی روڈ -

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ - لیاقت روڈ -

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
(فون 72071) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ -

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ میں
ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات
دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے بھی منگوائی جا سکتی ہیں۔

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل ہیں:-

ہر روز علاوہ جمعہ:- شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

محمد اسلام
کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز - الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

احتساب

(۴)

تشکیلِ پاکستان کے بعد جتنی حکومتیں وقتاً فوقتاً برسرِ اقتدار آتی رہیں اُن کے قابلِ اعتراض اقدامات پر طلوعِ اسلام کی طرف سے ساتھ کے ساتھ مؤاخذہ ہوتا رہا۔ ان تاریخی حقائق کی یاددہانی کے طور پر، انہیں احتساب کے عنوان سے پیش قارئین کیا جا رہا ہے۔ اس کی پہلی قسط طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری قسط اگست، اور تیسری قسط اکتوبر ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں۔ اب چوتھی قسط ملاحظہ فرمایئے۔ قارئین کی طرف سے اس "احتساب" کی یاددہانی کی جس فراخدلانہ انداز سے پذیرائی ہوئی ہے وہ ہمارے لئے بڑی حوصلہ افزا ہے۔

ہمارا بین الاقوامی مقام

مارچ ۱۹۵۲ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے لمعات میں بین الاقوامی محاذ کے جنگی فریقین (امریکہ و روس) کے مختلف اقوامِ عالم سے گٹھ جوڑ کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور پھر اس کی روشنی میں مسلم ممالک کو ان کا حقیقی مقام اور ملّی فریضہ یوں یاد دلایا گیا ہے۔

مسلمانانِ عالم کے لئے سیدھی راہ یہ ہے کہ وہ نہ امریکن بلاک کی تقویت کا باعث بنیں اور نہ روس کی طاقت کا موجب۔ ان کے نزدیک سگِ زرد اور برادرِ شغال دونوں یکساں ہیں۔ امریکہ کی خداپرستی کا دعویٰ قرآن کی رو سے، قطعاً خداپرستی نہیں اور روس کا یہ دعوےٰ کہ وہ مزدوروں اور غریبوں کی امداد کے لئے اٹھا ہے ایسی حق کی آواز ہے جو باطل کی تائید کے لئے بطور دلیل استعمال کی جا رہی ہے (کلمۃ الحق ارید بہ الباطل) ان کے لئے صحیح راہِ عمل صرف ایک ہے کہ وہ خود اُمتِ واحدہ بن کر قرآن کا نظامِ ربوبیت اپنے ہاں رائج کریں اور پھر دیکھیں کہ کس طرح روس اور امریکہ دونوں ان کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز نہیں ہوتے ہے

افرنگ زخودبے خبرت کرد و گرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

(شمارہ۔ مارچ ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۱)

صوبائی تعصبات

یہی ایام تھے جب بعض لیڈروں کی مفاد پرستیوں نے صوبائی تعصبات اور تفرقہ بازی کے شعلوں کو ہوا دے رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ٹاؤن، کراچی کے افتتاحیہ کا ذکر کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

پاکستان کے مسلمانوں میں مشرق و مغرب کی تمیز و تفریق ایک حقیقتِ ابدی کا بطلان اور ایک صداقتِ ازلی تکذیب ہے۔ ہم اپنے سینوں کو اس آفتابِ جہاں تاب کی درخشندہ شعاعوں سے مستنیر کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں جس کے متعلق فرمایا گیا کہ: لا شرقیۃ و لا غربیۃ۔ (جو نہ شرقی ہے، نہ غربی) اس لئے اگر ہمارے ذہن میں ایک ثانیہ کے لئے بھی مشرقی و مغربی پاکستان میں کسی قسم کی مغائرت و تفریق کا تصور آگیا تو ہم ان ازلی صداقتوں کے عملاً منکر ہوں گے جن پر ایمان ہمارے لئے وجہِ سعادت کونین ہے۔ یہ امتیازات اس دورِ جاہلیت کی تخلیق تھے جسے ہم جھٹک کر الگ کر چکے ہیں۔ اس لئے اب ان کی یاد تک بھی ہمارے دلوں میں نہیں آنی چاہیئے کہ جو بت حریمِ کعبہ سے ایک مرتبہ نکال دیئے گئے وہ وہاں دوبارہ باریابی نہیں پا سکتے۔ (ایضاً۔ ص۱۱)

محلاتی سازشیں

پاکستان کے ایک وزیرِ اعظم کی اپنے منصب سے علیحدگی پر طلوعِ اسلام نے صورتِ حال پر بحث کرتے ہوئے لکھا:۔

گزشتہ ڈیڑھ برس میں یہ بدبخت ملک جس تیزی سے تباہی اور بربادی کے جہنم میں دھکیلا گیا اس کی نظیر شاید ہی مل سکے۔ اس حکومت کی مثال اس کارندے کی سی ہو گئی تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ:۔

اینما یوجھہ لا یات بخیر (۱۶/۷۶)

اسے کہیں بھیجئے۔ کبھی خیر کی خبر لے کر نہیں آئیگا۔

پھر مصیبت یہی نہیں تھی کہ ملک پر اس بری طرح سے تباہی آ رہی تھی۔ اس سے بڑھ کر مصیبت یہ تھی، کہ اس تباہی کو تباہی کہنا جرم قرار پا گیا تھا۔ حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ قوم پر عالمگیر مایوسی چھا چکی تھی۔ لوگ کہنے لگے تھے تو اس آزادی سے تو غلامی ہزار درجے اچھی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بالآخر اس مصیبت کا حل کیا ہوگا! انہیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ تازہ واردانِ بساطِ حکومت جو ایک خانہ ساز ملی بھگت سے اقتدار کی مسندوں پر قابض ہو چکے ہیں۔ کبھی ان کرسیوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ وہ اپنے جی میں سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ جرِ ثقیل جو قوم کے سینے پر کابوس بن کر سوار ہو چکا ہے کبھی نیچے نہیں اترے گا۔ ظاہر ہے کہ قوم پر اس قدر مایوسی چھا جانا بڑا خطرناک ہوا کرتا ہے۔ اس کے انجام و عواقب بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ قومیں ہمیشہ امیدوں کے سہارے جیتی اور آرزوؤں کے بل بوتے پر آگے بڑھتی ہیں۔

(شمارہ۔ مئی ۱۹۵۳ء۔ ص۵)

آئین و ضوابط کی پابندی

۱۹۵۳ء میں، نازک صورتِ حال کی بنا پر، لاہور کا نظم و نسق فوج کے سپرد کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں جہاں اور بہت کچھ ہوا، وہاں یہ خوشگوار صورت بھی سامنے آئی کہ چوری چکاری، غنڈہ گردی، بدعنوانی اور رشوت ستانی

جیسی بیماریاں بھی دب گئیں۔ دوکاندار ناپ تول، بلیک مارکیٹ اور لوٹ کھسوٹ کے معاملوں میں بڑے محتاط ہوگئے۔ شہر کی صفائی قابلِ دید تھی اور سڑکوں پر آمد و رفت میں نظم پیدا ہوگیا۔ اس تبدیلی پر قومی نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:-

جو قومیں اپنے اندر زندگی کی صلاحیتیں پیدا کرکے آزادی حاصل کرتی ہیں، ان میں آئین و ضوابط کی پابندی اور عام معاشرتی اقدار کا احساس از خود پیدا ہوجاتا ہے۔ انہیں "بائیں کی طرف" چلانے کے لئے کسی سپاہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جو قومیں ان صلاحیتوں کے بغیر آزاد ہوجاتی ہیں ان کے نزدیک آزادی سے مفہوم ہوتا ہے "مادر پدر آزادی"۔ بدقسمتی سے ہمارا شمار اس آخری طبقہ ہی میں ہے۔ چنانچہ یہاں آزادی ملنے پر حاکم اور محکوم، رعایا اور افسر سب یہ سمجھنے لگ گئے کہ اب نہ کسی آئین کی ضرورت ہے، نہ قانون کی۔ نہ کسی قاعدہ کی پابندی لازم ہے نہ اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی۔ یہ بے راہ روی اس قدر عام ہوچکی تھی کہ حساس طبائع پر یکسر مایوسی چھا رہی تھی کہ بالآخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ بارے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہمارا فوجی عنصر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ معاشرہ کو ان خطوط پر چلا سکے جنہیں صحیح معنوں میں آزاد قومیں از خود قائم رکھا کرتی ہیں۔

لیکن اس قسم کا انتظام صرف ہنگامی طور پر قائم کیا جاسکتا ہے، مستقل طور پر نہیں۔ مستقل طور پر وہی انتظام کامیاب ثابت ہوتا ہے جس میں آئین و ضوابط کی پابندی دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہماری تعلیم گاہوں میں بچوں اور جوانوں کی تربیت اور تعلیم صحیح طریق پر شروع ہو جائے۔ جب اس قسم کے بچے زندگی کے میدان میں آئیں گے تو ان میں ایک آزاد قوم بننے کی صلاحیتیں پیدا ہوں گی۔

(شمارہ - مئی ۱۹۵۳ء - ص ۱۲-۱۳)

معاشرتی اُلجھنیں

مئی ۱۹۵۴ء کے لمعات میں لڑائی فساد اور قتل کی روز افزوں ..... وارداتاور ان کے محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے اور عوام کی بڑھتی ہوئی اعصابی کمزوری کو اس کی وجہ قرار دیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام معاملہ یہیں ختم نہیں کرتا بلکہ اپنے بھرپور جائزے میں یہ بھی بتاتا ہے کہ اعصاب دن بدن کیوں کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ پوری تفصیل سے بتاتا ہے کہ بلیک مارکیٹ، رشوت ستانی اور اس قسم کی دیگر بدعنوانیاں عوام کی ضروریاتِ زندگی اور دیگر معاملات میں کس قدر اضطراب انگیز اور صبر آزما کیفیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے:-

آپ سوچئے کہ جس معاشرہ میں انسان کے ساتھ قدم قدم پر یہ کچھ ہو اس میں اس کے اعصاب اپنی حالت پر قائم کیونکر رہ سکتے ہیں؟ اعصاب ہی تو ہیں، فولاد کی تاریں تو نہیں۔ دل ہی تو ہے، سنگ و خشت تو نہیں! جن اعصاب کے ساتھ برسوں سے یہ

کچھ ہو رہا ہو وہ بات بات پر تمتما نہ اٹھیں تو کیا کریں؟ ابھی تو ابتدا ہے اس صورتِ حال کو ذرا آگے بڑھنے دیجئے آپ دیکھیں گے کہ معاشرہ میں پاگلوں کی تعداد کس قدر بڑھ جاتی ہے.....

یہ کچھ وضاحت کرتے ہوئے وہ صورتِ حال کی خرابی کے لئے حکومت کو براہِ راست ذمہ دار گردانتا ہے اور لکھتا ہے:-

ملک کی یہ حالت ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جو اندھوں کو بھی دکھائی دیتی ہے لیکن حیرت ہے ہمارے اربابِ حل و عقد پر کہ یا تو ان کی آنکھیں ایسی بند ہیں کہ وہ اس حالت کو دیکھ ہی نہیں سکتے اور یا وہ اس قدر خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ حکومتیں اسی طرح چلتی ہیں۔ ملک میں افلاس کا یہ عالم ہے لیکن ان کی بجٹ کی تقریریں پڑھیئے۔ ان میں بتایا گیا ہوتا ہے کہ ملک میں ہن برس رہا ہے۔ غذا کی حالت یہ ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ ہمیں اس سوال نے فکر مند کر رکھا ہے کہ ہم اپنے فالتو اناج کو کیا کریں..... شروع شروع میں لوگ اس قسم کے بیانات اور تقاریر سے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ اگر ان بیانات میں کوئی سچی بات بھی ہوتی ہے تو لوگ اس کا بھی یقین نہیں کرتے۔ اس ابتری کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار کو اپنے اندرونی خلفشار ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ ان کی تمام توانائیاں اپنی اپنی پارٹی کی تقویت اور اپنی اپنی پوزیشن کے استحکام کی نذر ہو جاتی ہیں۔ (شمارہ۔ مئی ۱۹۵۴ء۔ صـ)

اقبالؒ اور حکومت

یومِ اقبالؒ کی تقریب پر اس سال بھی حکومتِ پاکستان کے کارفرماؤں نے اپنی روایتی شانِ بے نیازی کا ثبوت دیا۔ اس بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:-

۱۸ اپریل تک اس تقریب کے متعلق کسی کو کانوں کان خبر تک نہ تھی۔ ۱۹ اپریل کو اقبالؒ سوسائٹی کی طرف سے ایک پبلک جلسے کا اعلان ہوا۔ یہ جلسہ ۲۱ اپریل کی شب کو منعقد ہوا۔ عوام کو اقبالؒ سے عشق ہے اس لئے وہ اس کے نام پر جوق در جوق جمع ہو گئے۔ لیکن حرام ہے جو اکابرین میں سے کسی ایک کی صورت بھی وہاں دیکھنے کو ملی ہو۔ ظاہرا تزئین و آرائش سے قطع نظر معنوی حیثیت سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی زندگی بخش تقریب نہیں منائی جا رہی، اس تقریب کی "تجہیز و تکفین کی رسم" ادا کی جا رہی ہے اور وہ بھی بے گار سمجھ کر.....

یہ کچھ مملکتِ پاکستان کے دارالسلطنت (کراچی) میں ہوا جب وزیرِ اعظم اور وزرائے کابینہ ہی نہیں بلکہ مجلسِ قانون ساز کے اراکین تک بھی کراچی میں موجود تھے۔

(شمارہ۔ مئی ۱۹۵۴ء۔ صـ)

اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا وہ ارباب حکومت کے لئے تازیانۂ عبرت کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنئیے!

اقبالؒ اس سے بہت اونچا ہے کہ اس کی تقریبات منائی جائیں یا نہ منائی جائیں۔ اس سے اس کی بلندی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس سے یہ ضرور نظر آجاتا ہے کہ ہم کس قدر پست ہیں۔ اور اس پستی کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ اقبالؒ کی وفات پر جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں اس کی عظمت اور محبت لوگوں کے دلوں میں اور بڑھتی جا رہی ہے لیکن ہمارے اربابِ حل و عقد کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے جس شخص سے مسندِ حکومت چھن جاتی ہے وہ یہیں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ اور کوئی بات تک نہیں پوچھتا۔ یہ فرق ہوتا ہے ذاتی اور اضافی قیمت میں۔

قومیں انہی افراد سے زندہ رہ سکتی ہیں جن میں ذاتی جوہر ہوں اور ایسے افراد کی قدر کرنا وہی لوگ جھوٹرتے ہیں جو خود ذاتی جوہروں سے محروم ہوتے ہیں۔ (ایضاً)

عوام اور ان کے کارفرما

اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں ملکی صورتِ حال کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملک کے اربابِ اقتدار اپنی مفاد پرستیوں کے جنون میں کس قسم کے کھیل کھیل رہے ہیں اور ان سے ملک کا مستقبل کن خطرات سے دوچار ہوگا۔ اس سلسلے میں، سب سے پہلے حکومت اور پیشوائیت کے گٹھ جوڑ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ:

قرآن کی رو سے، اس سے بڑھ کر انسانیت کی تذلیل اور نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ جائے۔ غلامی کہتے ہی اسی کو ہیں۔ پاکستان میں رزق کے سرچشمے سمٹ سمٹا کر چند خاندانوں کے اندر محدود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح زمامِ اقتدار، رفتہ رفتہ، انہی کے ہاتھوں میں آتی جا رہی ہے۔ یہی وہ لبادہ لوٹ ہے جس میں، عصرِ حاضر میں ملوکیت جلوہ بار ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں ملوکیت کی جڑیں دن بدن مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ باقی رہی مذہبی پیشوائیت، سو (غیر منقسم) ہندوستان میں اس کی شکل انفرادی تھی، لیکن یہاں اس نے جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے جب اور جہاں بھی ایک جتھے کی صورت اختیار کی ہے وہ انسانیت کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے لئے ٹڈی دل بن گئی ہے۔

(شمارہ اگست ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۹)

اس کے بعد اربابِ اقتدار کے عوام سے بُعد و مغائرت کی تفصیل سامنے آتی ہے۔

ہمارے اربابِ بست و کشاد نے اپنے آپ کو عوام سے اس قدر الگ رکھ چھوڑا ہے اور وہ اس نچلے طبقے سے اس قدر دور اور بلند ہو چکے ہیں کہ انہیں اب غالباً اس کا احساس تک بھی نہیں رہا کہ عوام کس طرح زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ اجنبی حکومت کو اس لئے اجنبی نہیں کہا جاتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے لوگوں کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ اجنبی اس لئے ہوتی ہے کہ اس میں عوام اور حکمران طبقے میں اس قدر بُعد اور بُعد اجنبیت ہوتی ہے کہ لوگ اس حکومت کو اپنی حکومت نہیں بلکہ اجنبی حکومت سمجھ رہے ہیں —— اس

سے بھی زیادہ اجنبی جتنی وہ انگریزوں کی حکومت کو سمجھتے تھے۔ (ایضاً۔ ص۱۰)

اس کے بعد ان کی بے حسی اور نالائقی کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے:۔

باقی رہیں عوام کی جائز شکایات تو ان کے متعلق ہار تھک کر یہی سمجھ لینا پڑتا ہے کہ ان حضرات کے پاس وہ آنکھیں ہی نہیں جو اس عذاب کو دیکھ سکیں جس میں یہ کروڑوں انسان بُری طرح مبتلا ہیں۔ وہ کان ہی نہیں جن سے وہ اس چیخ و پکار کو سُن سکیں جس سے یہ ساری فضا اس وقت ماتم کدہ بن رہی ہے۔ اور اگر آنکھیں اور کان ہیں تو پھر ان کے سینے میں وہ دل ہی نہیں جو جہنم کے ان شعلوں کی تمازت سے ذرا بھی پگھل سکے جس میں قوم اس بُری طرح سے جھلس رہی ہے۔ اور تو اور، غالباً ان کے کندھوں پر وہ سر بھی نہیں جو اس خطرہ کا ہی اندازہ کر سکے جو ملک کے لئے (بلکہ خود ان کے اپنے لئے بھی) اس صورتِ حالات سے پیدا ہو رہا ہے اور اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جہانبانی کے لئے، دردمندی کو چھوڑیئے، کم از کم دانشمندی کی تو ضرورت ہوا کرتی ہے لیکن یہاں تو نہ درد ہے نہ دانش۔ ملک کے عوام ایک عذابِ مسلسل سے گزر رہے ہیں اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کسی کو اطمینان کا سانس نصیب ہو ــــ دردمندی کا تقاضا تھا کہ اس جہنم کو دیکھ کر، ذمہ دار حضرات کا دل خون بن کر آنکھوں سے بہہ نکلتا اور ان پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی۔ لیکن ہمارے یہ جہاندار ہیں کہ کیا مجال جو ان کی عشرت سامانیوں میں ذرا سا بھی خلل پڑ جائے ..... لوگ بیچارے رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، پکار رہے ہیں لیکن اس صحرائے اعظم میں کوئی سننے والا ہی دکھائی نہیں دیتا۔

(ایضاً ــــ ص۱۱)

اس کے بعد طلوعِ اسلام اس نظامِ کہن میں انقلاب کی دعوت دیتا ہے۔ ایسے انقلاب کی جو قلب و نگاہ کی گہرائیوں سے اُبھرے اور، مملکت کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے، اصلاحِ احوال کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

سوال یہ ہے کہ اگر ملک کی موجودہ قیادت اس باب میں (دانستہ یا نادانستہ) کچھ نہیں کرتی یا کچھ کر سکنے کی اہل نہیں تو کیا ملک کے دوسرے لوگوں کا فریضہ فقط اتنا ہی ہے کہ وہ ان پر تنقید کر کے مطمئن ہو جائیں؟ اگر کشتی کے ملاح سو جائیں یا چپو رکھ کر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو جائیں تو کیا اہلِ کشتی کا اتنا ہی کام ہے کہ وہ یہ کہہ کر کہ یہ ملاح کیسے نااہل ہیں، خود حقہ پینے بیٹھ جائیں؟ کیا کشتی کے ڈوبنے سے فقط ملاحوں کا نقصان ہوگا؟ اہلِ کشتی کا کچھ نہیں بگڑیگا؟ ..... آپ جو تدبیریں بھی سوچیں اس میں ایک اصول کو ضرور پیشِ نظر رکھیں اور وہ یہ کہ حکومت اور مملکت میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ وزارتیں بنتی ہیں اور ٹوٹتی ہیں۔ لیکن مملکت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ آپ اصلاحِ حال کے لئے غلط کار حکومت کو ضرور بدلیئے۔ آپ ملک اور نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے نقصان رساں نظام

کی جگہ منفعت بخش اور انسانیت ساز نظام کو قائم کیجئے۔ لیکن اس تبدیلی کی کوشش میں کوئی قدم ایسا نہ اٹھایئے جس سے مملکت کو کسی طرح کا نقصان پہنچے۔ (ایضاً۔ ص۱۴)

حقائق کا سامنا کیجئے

ستمبر ۱۹۵۴ء کے لمعات بڑا ہی اہم موضوع لے کر سامنے آئے۔ اس مقالہ میں کارفرمایانِ مملکت کی دھواں دھار اور جذبات انگیز تقریروں کے حوالوں سے بتایا گیا تھا کہ آزادی کے حصول کے بعد بھی ہمارے رہنما حقائق کا سامنا کرنا نہیں سیکھے۔ حالانکہ نئے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی اہم ذمہ داریوں کی بنا پر وہ اپنی نوزائیدہ مملکت کے ہر معاملہ میں سنجیدگی اختیار کرتے۔

کتنا ہی اہم مسئلہ درپیش ہو۔ کیسا ہی نازک سوال زیرِ غور ہو۔ کیسا ہی مہیب خطرہ سامنے ہو۔ کیسی ہی جاں فرسا مصیبت سر پر منڈلا رہی ہو۔ ہمارا کوئی لیڈر یہ نہیں بتائے گا کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔ اس کا ازالہ، اور ماعلیہ کیا ہے۔ یہ خطرہ کیوں پیدا ہو رہا ہے۔ یہ گھٹا ہمارے سروں پر کیوں منڈلا رہی ہے۔ اور اب اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہمارے سامنے کیا سکیم ہے۔ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیوں کرنا چاہیئے۔ ان میں سے کوئی بات نہیں کی جائے گی۔ بس کہا جائے گا تو یہ کہ تم خدا کی آسمانی آگ ہو۔ اور یہ باطل خس و خاشاک ہے۔ اٹھو اور اس خس و خاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دو۔ (شمارہ ستمبر ۱۹۵۴ء۔ ص۶)

اور پھر اس کے بعد اس نے یہ حقیقت سمجھائی کہ:-

جب تک پاکستان کا تصور نہیں ملا تھا ہمارے ہاں اس قسم کی تقریریں ایک حد تک قابلِ فہم تھیں اس لئے کہ اس وقت ہمارے سامنے کوئی واضح نصب العین اور کوئی متعین پروگرام نہیں تھا۔ . . . . پاکستان کا تصور ملنے کے ساتھ ہی زمامِ قیادت خوش قسمتی سے قائدِ اعظمؒ جیسے بارد منطقی (COLD LOGICIAN) کے ہاتھ میں آگئی جو ہر مسئلہ کو دو اور دو چار کی طرح سمجھنے اور پانچ اور پانچ دس کی طرح سلجھانے کے عادی تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہماری تاریخ نے ایک نیا ورق الٹا۔ اب ایک خطۂ زمین ہمارے پاس تھا جسے ہم نے ایک خاص مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔ اب ہماری منزل بھی متعین تھی اور راستہ بھی۔ ہمارے خطرات بھی واضح تھے، اور ان کے حل بھی صاف صاف۔ . . . . . . لہٰذا ہمارے ہاں اس سابقہ "شاعری" کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن ہم گذشتہ سات سال سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے رہنما بدستور اسی "بیت بازی" میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہی لفظی گورکھ دھندے، وہی مچھے دار تقریریں، وہی جذبات انگیز شعلہ فشانیاں اور وہی شاعرانہ رجز خوانیاں۔ اس سات سال میں ہماری مصیبتوں میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ ملک کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی ہے۔ . . . . . . یہ سب کچھ ہوتا گیا ہے لیکن کیا مجال جو ہمارے اربابِ حل و عقد کی شاعری میں ذرا سا بھی فرق آیا ہو۔ (ایضاً)

ذمہ داریوں سے فرار

کشمیر کے بہت بڑے حصہ پر بھارت کے قبضے اور وہاں سے دریاؤں کے رخ موڑنے سے پاکستان کے لئے جن خطروں کا امکان تھا، اربابِ حکومت

کی ان سے بے نیازی پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:-

ارباب سیاستِ پاکستان کو اس کی فرصت کہاں کہ وہ سوچیں کہ ہندوستان دریاؤں کے رُخ موڑ رہا ہے۔ کشمیر میں کس طرح پنجے گاڑ رہا ہے اور پاکستان کو کس طرح مفلوج کر رہا ہے۔ ایک طرف پاکستان میں قدرت نے تباہی مچائی۔ پہلے بنگال میں بے پناہ سیلاب آئے جو بے تحاشہ بارشوں کا نتیجہ تھے ..... پھر پنجاب کو بارش نے آگھیرا۔ اکثر بڑے بڑے شہر اور ہزاروں گاؤں دیکھتے دیکھتے زیرِ آب آ گئے ..... اِدھر قدرت نے یہ تباہی مچا رکھی ہے اور اُدھر لیڈرانِ قوم ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور رہی سہی کسر پوری کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

(شمارہ نومبر ۱۹۵۴ء — صفحہ ۶۸)

سیاسی پارٹیاں

سیاسی پارٹیوں کی باہمی آویزشوں اور ٹکراؤ سے ملک کو جن ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑا اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے طلوعِ اسلام نے ایک بار پھر اس قرآنی حقیقت کو دہرایا۔

جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں سے یہ جواب ملتا ہے کہ فرعون کی سب سے بڑی ابلیسی حکمت یہ تھی کہ وہ ملک کو پارٹیوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ اسلام کے خدا نے ملت میں مختلف پارٹیوں کے وجود کو (خواہ وہ مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں) اپنا غضب اور لعنت قرار دیا اور اسے شرک ٹھہرایا ہے۔ جب تک ہماری حالت یہ رہے گی کہ ہمارے لبوں پر اسلام رہے گا اور دلوں میں مغربی معاشرت اور نظام کا تقدس اور عظمت، ہم اسلام کے قریب کبھی نہیں آسکیں گے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی پہلی اشاعت (جنوری ۱۹۴۸ء) میں کہا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی اسے مٹا دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ملک میں باقی پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ اور ملک کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ مسلم لیگ اپنے اعمال کی بدولت اپنی موت آپ ہی مر رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب اس ممی شدہ لاش کو اپنے ہاتھوں دبا دیا جائے تو اچھا ہے ورنہ اس کی اور بھی بے حرمتی ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کو پارٹیوں کی لعنت سے قانوناً پاک کر دیا جائے۔ ملتِ اسلامیہ، دنیا میں، باطل کے مقابلہ میں، خود ایک پارٹی ہے اس پارٹی کے اندر پارٹیاں بنانا ملت کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سازش کو کب تک روا رکھا جائے گا۔

(۱) پرچہ نہ ملنے کی صورت میں خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ضرور بھیجیں تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو۔ (ناظمِ ادارہ)